مسرت کی تلاش

وزیر آغا

اکادمی پنجاب لاہور

سلسلۂ فکرِ جدید

شمارۂ اوّل (۱)

مسرّت کی تلاش

طبعِ اوّل

وزیر آغا
ایم۔ اے

ناشرین
اکادمی پنجاب - ادبی دنیا منزل - لاہور

قیمت عہ
دو روپے

اراکینِ اکادمی سے
ایک روپیہ آٹھ آنے

بارِ اوّل

جنوری سنہ ۱۹۵۴ء

عام اور تاجرانہ فروخت کیلئے

سول ایجنٹ

میسرز پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ ـــــــ انار کلی لاہور

فہرست

والدِ محترم کی خدمت میں

وزیر آغا

گلزارِ ہست و بُود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اقبالؔ

پیش لفظ

اکادمی پنجاب جن مقاصد کی تحصیل و تکمیل کے لئے قائم ہوئی ہے، اُن میں ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ ملک کے "اردو خواں" طبقے کی فکری سطح بلند کی جائے اور اُس کے مطالعہ کے لئے ایسی کتابیں بہم پہنچائی جائیں، جن کے مطالب فکر انگیز، مگر اسلوبِ بیان سادہ اور دل آویز ہو۔ مجھے مسرّت ہے کہ اکادمی کے اس منصوبے کی ابتداء ایک ایسی کتاب سے ہو رہی ہے جو مطالب کی فکر انگیزی اور بیان کی دلآویزی دونوں اعتبارات سے کامیاب ہے اور جسے ہماری زبان میں اپنی قسم کی ایک نہایت اچھی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

وزیر آغا نے **مسرّت کی تلاش** لکھ کر ہماری زبان کے اہلِ قلم کے لئے ایک بہت عمدہ مثال قائم کی ہے اور صحت مند ادب کی تخلیق و اشاعت کا ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ زندگی ایک گلِ صد برگ ہے، جس کی ہر پتی اپنے مشام میں غیر فانی نکہتوں کا ایک مخزنِ بے پایاں رکھتی ہے۔ اب بھنوروں کو یہ کون سمجھائے

کہ ایک آدھ پتّی ہی کا ہو رہنا اور اُسی کے رس کو زندگی کا مآل تصوّر کر لینا، کہاں کی عشق بازی ہے۔ فیضؔ سے

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

انسانی زندگی اپنے لاتعداد مسائل اور رنگا رنگ کیفیتیں اپنے دامن میں لئے ہر وقت اُن مردانِ ہوشمند کی منتظر ہے، جو انسان کو ایک بہتر، خوبتر، اور جمیل تر زندگی بسر کرنے کا انداز سکھائیں اور اُسے جنّتِ موعودہ کے دامِ خیال سے نکال کر اسی جنّتِ ارضی کے لذائذ و انعام سے بہرہ یاب ہونے کا راز بتائیں۔ وقت ہے کہ ہمارے اہلِ قلم رسمی ادبیات کے تنگ گلی کوچوں سے نکلکر زندگی کے کشادہ و وسیع میدان میں اُتریں، جہاں تعمیرِ افکار کا بیشمار مسالہ ہر طرف بکھرا پڑا ہے، پھر وہ چاہیں تو اسی سے فکر کے ایسے رفیع الشان قصر تعمیر کرلیں جنکی بلندی پروازِ تخیّل اور رنگینی مُرورِ ایام پر ہمیشہ ہمیشہ تک خندہ زن رہے۔

از بسکہ کتاب ایک روشن خیال نوجوان نے لکھی ہے، موزونیت کا تقاضا تھا کہ اُس کا مقدّمہ بھی ایک ایسا نوجوان لکھے، جسے نوعمری کے باوصف، زندگی کی ماہیّت اور اسکے خوب و زِشت پر کچھ غور و فکر کرنے اور اپنے نتائجِ فکر کو سلیقے سے جامۂ الفاظ پہنانے کا موقع عطا ہوا ہے۔ مجھے مسرّت ہے کہ وزیر آغا نے اس خدمت کی انجام دہی کے لئے جس رفیق کا انتخاب کیا، وہ نہ صرف اُنکے معیارِ انتخاب پر پورا اُترا ہے بلکہ اُس نے ایک واقعی فکر انگیز اور دلآویز دیباچہ لکھکر خود تلاشِ مسرّت کے تقاضوں کو بھی پورا کیا ہے۔

صلاح الدّین احمد

مقدّمہ

"خود کو پہچان" یہ تھی سقراط کی تعلیم۔ سقراط صوفی منش آدمی تھا۔ اُس نے جب مشاہدۂ باطن، خود نگاہی اور خود شناسی کا سبق دیا، تو اُس کا روئے سخن سالک کی ذات کی طرف تھا۔ اُس کے مسلک میں قدیم یونانی فلسفے کی طرح فردِ واحد کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ البتّہ افلاطون نے جو اِس مقولے کی تفسیر پیش کی ہے اُس سے یونانی حکمت میں ایک نئے نقطۂ نظر کا اضافہ ہُوا ہے۔ افلاطون نے انفرادی خود شناسی کی بجائے اجتماعی خود آگاہی کو تحقیق و تجسّس کی آخری منزل قرار دیا ہے۔ اس کی نظر میں انسانی فطرت کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسے کسی قدیم کتبہ یا لوح پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے کی کوشش۔ انفرادی تجربہ جس نوشت کو پیش کرتا ہے وہ ایسے باریک اور شکستہ حروف میں لکھی ہوئی ہے کہ اسے برسوں کی چشم سوزی کے بعد بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔ انسان کی اجتماعی

زندگی انہی حروف کو ایک بڑے پیمانے پر پھیلا کر ہماری نظروں کے سامنے لا رکھتی ہے۔ اس طرح ہر نقش واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔ اور پوری عبارت کا مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے۔ افلاطون کی نظر میں سیاسی اور معاشرتی تنظیمات کا مطالعہ ہی انسان کی فطرت کی صحیح عکاسی کر سکتا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ ریاست شہریت کی بلند ترین تخلیق ہے اور ریاست ہی کے پیکر میں انسان کے خدّو خال پورے طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ یونانی تمدّن اور حکمت کی تاریخ میں وہ لمحہ بہت ہی اہم ہے جب افلاطون نے انفرادی بصیرت اور تجربہ پر فلسفہ کی بنیاد رکھنے کی بجائے انسان کے اداروں، اُس کے معمولات اور وسائل، اور اُس کی سماجی زندگی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔

افلاطون کے نظریوں کا اور قدیم تر یونانی فلسفے کا تقابل یہ بات سمجھاتا ہے کہ ہمیشہ سے دو چشمے علم و دانش کے چمن کی آبیاری کرتے آئے ہیں ایک طرف تو وہ جہاندیدگی اور زمانہ شناسی ہے جس کا سبق تاریخ سے حوادثِ روزگار سے اور کشاکش ہائے ہستی سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ نظر ہے جسے پانے کے لئے آدمی خود اپنی آگ میں جلتا ہے اور خود اپنا تماشائی بنتا ہے۔ مسرّت کی تلاش میں انسان انہی دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا آیا ہے۔

ایک تو وہ مشرب ہے جسے اختیار کرکے آدمی اچھا شہری بنتا ہے اور اپنی کمزوری اور تنہائی پر قابو پانے کے لئے وہ اپنی ذات کو ایک منظم اور منضبط معاشرہ سے وابستہ کرتا ہے۔ یہ وابستگی اُس کے سماجی شعور کو پختہ تر بناتی ہے۔ خانگی اور جماعتی ذمہ داریوں کا احساس، قومی رسم و رواج کا احترام، حُسنِ اخلاق، نظم و نسق کا تحفّظ، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، ہم نفسوں کی رفاقت، ہمسایہ کا پاس، دوسروں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی عادت یہ سب باتیں آہستہ آہستہ اُس کی سیرت کا جزو ہو جاتی ہیں۔ وہ مِل جُل کر کام کرنے اور مشترکہ محنت کے پھل کو بانٹ کر کھانے کا گُر سیکھتا ہے۔ سماجی ہمہ اوست کے نشے میں مگن، وہ شہد کی مکھّی کی طرح کام کئے جاتا ہے اور اپنے خونِ گرم کو سماج کے تعمیری مقاصد کی نذر کر دینے میں وہ اپنی شخصیّت کی معراج اور تکمیل دیکھتا ہے۔ اس خود سپردگی میں صرف عافیت کوشی کا رنگ ہی نہیں، ایک مثبت، جیتی جاگتی اور زندگی بخش مسرّت کا احساس بھی ہے۔ یہ مسرت انسان میں دلجمعی، خود اعتمادی اور وقار پیدا کرتی ہے اور اُسے اپنی قدر و قیمت سے آشنا کراتی ہے۔ انسانی تعلقات کی حِدّت و حلاوت اور سماجی رشتوں کی معنویت اسی شعور کا نتیجہ ہے۔ اس شعور کی بدولت انسان اپنی کم مائیگی کے احساس پر قابو پاتا ہے۔ رکھ رکھاؤ

خوش وقتی و خوش سلیقگی سے زندگی بسر کرنے کا ڈھب سیکھتا ہے، زندگی کو سہل تر اور خوشنما تر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ تعمیری کاموں اور عملی معرکہ آرائیوں کے علاوہ روزانہ زندگی کا رنگِ طرب، جلسے اور ہنگامے، ہمدمی و ہمرازی، مہر و وفا، شکوہ و شکایت اور تمام تعلقات جو زندگی میں رچاؤ اور رنگینی پیدا کرتے ہیں، اسی "پابستگیٔ رسم و رہِ عام" کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا راستہ ایک ایسی پگڈنڈی ہے جس پر صرف تنہا آدمی چل سکتا ہے۔ یہ ایسے خود بین و آزاد لوگوں کا مسلک ہے، جو خضر کی قیادت کو بھی قبول نہیں کرتے۔ اکیلے پن کو بھلانے کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو اتنا وسیع کر ڈالے کہ اُس کی حدود تک نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ اپنے جامِ جہاں نما میں پوری کائنات کا عکس دیکھے، بجائے خود محشرِ خیال بن جائے اور دن رات دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے اصنامِ خیالی کی پرستش کئے جائے۔ ایسا ہی آدمی اپنے متعلق یہ کہہ سکتا ہے۔ ؎ دیرم۔ صنم ام۔ برہمن ام۔ زنّار ام

بہت کم لوگ اِس مشرب کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور جو اس راستہ پر چل اُٹھتے ہیں وہ بسا اوقات ایسے دُور دراز مقامات کی سیاحت کو روانہ ہو جاتے ہیں کہ اِن کی واپسی کی امید کم رہ جاتی ہے۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

ایسے لوگ عام طور پر بے فیض ہوتے ہیں اور صرف اپنے لئے جیتے ہیں۔ ان میں جو دو چار لوٹ آئے ہیں، وہ مسرّت اور بہجت کے ایسے سرچشموں کا سراغ لگا آئے ہیں، جن سے صدیوں تک تشنہ لبوں کی پیاس بجھتی رہی ہے۔ دُنیا کے پیغمبر، صوفی، بلند مرتبہ فلسفی، فن کار، شاعر اور ادیب انہی لوٹ آنے والے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی وساطت سے ہم اس عالمتاب مسرّت سے ہمکنار ہوتے ہیں جسے کتاب کے مصنّف نے "احساسِ بحر آسا" کا نام دیا ہے۔

انسانی تاریخ و تمدّن کے پس منظر میں مسرت کی تلاش مختلف مراحل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

پہلی منزلِ اوّلیں قبائل کی وہ زندگی ہے۔ جس میں خارج و باطن، فرد و جماعت، خواب و حقیقت کا تضاد پورے طور سے ظاہر نہیں ہوا تھا۔ زندگی میں ایک بے لوث اہماک تھا۔ بچّوں کی سی معصومیت جو ہر نئے تجربے سے دامن بھر لینے کے لئے بیقرار رہتی تھی۔ زندگی شعبوں اور خلیوں میں نہیں بٹی تھی۔ اور نہ کہیں اکیلے پن کی اُداسی تھی۔ انسان بیک وقت دیوی دیوتا، شجر، پھول، ندی، پہاڑ اور چاند ستاروں سے ہم کلام ہو سکتا تھا۔

اشیاء کے باہمی ربط و تسلسل کا احساس اُس کی قوتِ مشاہدہ کی کمزوری کا نتیجہ نہیں تھا۔ کیونکہ اُس زمانے کا آرٹ انسان کی جزو بینی اور تیز نگاہی کا سب سے بڑا شاہد ہے۔ اس احساس کا ماخذ ایک قوی ترجذبہ ہے ـــــ زندگی کی وحدت و یکتائی کا تصور، یہ احساس کہ ایک ہی موجِ بہار نے سینکڑوں پھول کھلائے ہیں، ایک ہی جیون جیوتی سے لاکھوں دیپ روشن ہیں، فطرت ایک جیتے جاگتے، گاتے، ناچتے قبیلے کی طرح تھی۔ جس میں کوئی درجہ بندی، کوئی چھوٹے بڑے کا فرق نہ ہو۔ چنانچہ دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں انسان کو کوئی شرف اور امتیاز حاصل نہیں تھا۔ ہر برادری کسی حیوان سے منسوب ہوتی تھی اور ہم نسلی کا قومی احساس سماجی رشتوں کی مضبوطی کا ضامن تھا۔ موت کا تصوّر بھی پیدا نہیں ہُوا تھا مرنے والے اپنے گھروں میں دیوی دیوتا بن کر رہتے تھے، نہیں تو ہر تہوار پر اُن کی روحیں پاتال سے لوٹ آتیں۔ دعوتوں میں شرکت کرتیں ناچ اور رسموں ریتوں میں شامل ہوتیں۔ اس زندگی میں ایک قسم کی یکسوئی تھی، ربط و ہم آہنگی کا احساس، جو انسان کو اُس کی سماج سے اور کُل کائنات سے بیک وقت منسلک رکھتا تھا۔ اسی لئے حصولِ مسرّت میں شعوری کوشش کی کیفیت اور کاوشِ طلب کا انداز نہیں پیدا ہُوا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے عرصہ تک انسان اِسی حالت میں رہا۔ لیکن

یہ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ انسان کی لکھی ہوئی تاریخ سے کہیں زیادہ طویل ہوگا۔
سفر کی اگلی منزل شہری تہذیب کے وہ کلس، مینار اور گنبد ہیں جو ہمیں انسانی تاریخ کی پہلی شعاعوں میں جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ سنہ ۵۰۰۰ ق م اور سنہ ۳۰۰۰ ق م کا درمیانی وقفہ ہے۔ اس زمانے میں دریائے نیل، دجلہ و فرات، سندھ اور قدرے بعد چین میں دریائے ہوانگ کے کنارے شہر آباد ہوئے۔ مصر کے مقبروں، ہڑپہ اور موہنجو دارو اور خاص طور پر حضرت ابراہیم کے وطن اُر میں جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے اس تہذیب کا کچھ سراغ ملتا ہے۔ ان شہروں کی عظیم الشان منصوبہ بندی اور وسیع پیمانہ کی تعمیرات سے صرف اُن لوگوں کی ہنرمندی اور محنت کشی ہی کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان مندروں مقبروں اور شہروں کی تخلیق ایک ایسی ہی سماج کر سکتی تھی، جو مشین کی طرح منظم ہو اور جس کا ہر فرد ضابطہ کا پابند اور حکم حاکم کا تابع ہو۔ عراق و عجم کے شہروں کی تجارتی گہما گہمی سے جس ذہنیت اور جس اُسلوب زندگی کا پتہ چلتا ہے اُس میں امن، سلامت روی، ایمانداری، سفید پوشی، حقوق و فرائض کا احساس اور پختہ سماجی شعور کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ اسی طرح موہن جو دارو کے مکانوں اور بازاروں کے قاعدے اور ترتیب سے ایک ایسی ہی مدوّن و مرتب معاشرت کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ بالغ قسم کی اجتماعیت

اور مادی وسائل کی حیرت انگیز ترقی کے بالمقابل اعلےٰ روحانی اقدار کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ قدیم ترین قبائل کے اعتقادات میں بھی اس زمانہ کی مذہبیت سے زیادہ بالیدگی پائی جاتی ہے۔ عبادت کا مقصد محض دیوی دیوتاؤں کو رشوت دے کر خوش رکھنا تھا۔ راہب بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے۔ بہترین محلوں میں رہتے تھے۔ سیاسی طاقت بھی بہت حد تک انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ ضروری نہیں کہ مذہب کی آڑ میں وہ دوسروں کو بیوقوف بناتے ہوں۔ مذہب کی حیثیت محض ایک کارآمد سماجی ادارے کی تھی اور لوگ شاید اس حقیقت سے باخبر بھی تھے اور مطمئن بھی۔ علوم کی ترقی ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر رُک گئی تھی جس سے آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ علم و فضل ذوقِ تجسّس کی سیرابی یا روحانی تقاضوں کی تسکین کا ذریعہ نہیں تھا؛ بلکہ محض روزمرّہ کی کار برآری کا وسیلہ تھا۔ ریاضی فنِ تعمیر کی تابع۔ فلکیات آبپاشی اور زراعت کی معاون، اور ہندسہ تجارتی اغراض کی پیداوار۔ البتہ فنونِ لطیفہ اور دستکاری کو بہت اہمیّت حاصل تھی۔ خاص طور پر نقاشی اور موسیقی کو۔ مزیّن ساز، خوشنما زیور، اور منقّش ظروف اُن کی گھریلو زندگی کے اجزاء تھے۔ گھریلو چیزوں سے انہیں اتنی محبّت تھی کہ قبروں میں بھی انہیں ساتھ لے جاتے تھے۔ اس تہذیب کا مطالعہ اُن

خوش باش باعمل اور سرگرم انسانوں کی زندگی پیش کرتا ہے جو سماجی خمیر کی حدت سے اپنی نمو پاتی تھی۔ یہ تھے وہ لوگ جو طور وسینا کی رفعتوں کی بجائے اپنی گلیوں کی لوبان اور صندل سے بوجھل فضاؤں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ جو صحرا کی خاک چھاننے کی بجائے آپس میں مل بیٹھ کر اور فراغت و آسائش سے عمر بسر کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ تھے وہ شہر جن سے آلِ ابراہیمؑ نے ہجرت کی اور جنہیں وہ ہمیشہ انسانی روح کا بندی خانہ کہتے رہے ہیں جن پر ہمیشہ لعنت بھیجتے رہے۔

اِرتقا کی اگلی منزل سنہ ۵۰۰ ق م کے قریب کا زمانہ ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ سنہ ۸۰۰ سے سنہ ۲۰۰ ق م کا درمیانی وقفہ۔ اس زمانہ میں چین ایران، فلسطین، ہندوستان اور یونان میں بیک وقت لیکن آزادانہ طور پر انسان کی روحانی بنیادیں تشکیل پا رہی تھیں، اور انہی بنیادوں کے استحکام پر انسان آج بھی سہارا کئے ہوئے ہے۔ اس مختصر سے زمانے میں بہت سے عجیب واقعات رونما ہوئے۔ چین میں کنفیوشس اور لاؤزے اور ان کے بعد موزے اور چوانگ زے نے پورے چینی فلسفہ کا تار و پود تیار کیا۔

ہندوستان میں یہ اُپنشدوں اور بدھ مت کا زمانہ تھا۔ یہاں بھی چین کی طرح فلسفہ کے تمام رجحانات مادیت اور تشکک پرستی سمیت پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ایران میں زرتشت نے نیکی اور بدی کی ازلی پیکار

کا تصوّر پیش کیا۔ فلسطین میں نبی پیدا ہوئے۔ ایلیجاہ، جرمیاہ، اشیعا۔ یونان نے ہومر کو جنم دیا۔ اور ہرقلیطس، ارشمیدس، افلاطون اور الم پرست شاعروں کو پیدا کیا۔

اس عہد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انسان کو پہلی مرتبہ اپنی عظمت کا احساس اور اپنی شخصیّت کے لامحدود امکانات کا علم ہوا۔ ہندوستان کے رشی، چین کے جہاں گرد راہب، اسرائیلی نبی اور یونانی فلسفی اپنے باہمی امتیازات کے باوجود دنیا کو ایک ہی پیغام دیتے سنائی دیتے ہیں۔ انسان اپنی ذات میں سمٹ کر اور نفس کی پہنائیوں میں کھو کر ہی کائنات کے رازوں کا امین بن سکتا ہے اور نورِ باطن اور فکر و وجدان ہی وہ مشعلِ راہ ہے جس کی روشنی میں چل کر اُس مسرّتِ لازوال کو پا سکتا ہے، جس کی انسان ازل سے جستجو کرتا آیا ہے۔

یہ دَور نواسنجیٔ بلبل کا عہد تھا۔ آرائشِ گل اور چمن بندی کی فرصت کسے تھی۔ مردانِ حق کی تعلیمات نے افراد کو متاثر کیا لیکن سیاست و معاشرت کی کوئی نئی تنظیم، کوئی بہتر شیرازہ بندی ظہور پذیر نہ ہو سکی۔ یہ لوگ اپنے بعد ایسے خزانے چھوڑ گئے تھے جن کا وارث بننے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد محض نفسا نفسی تھی اور شورِ محشر ——— ایک ہنگامہ جس میں ہر شخص ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتا

تھا۔ آزادیٔ نفس کا پیغام، انتشار و بے راہ روی کا نعرہ بن چکا تھا۔ بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں، شہر، قبیلے اور فرقے آپس میں مصروفِ پیکار تھے اس منظر سے گھبرا کر انسانیت نے ایک مرتبہ پھر جبر و استبداد کا طوق گلے میں پہن لیا۔ اور کنجِ قفس ہی میں عافیت چاہی۔ ع

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

چین میں شی اور سن خاندانوں کی بادشاہت آئی۔ ہندوستان میں موریا سلطنت کا استحکام ہُوا۔ مغرب میں رومتہ الکبریٰ نے اپنا تسلّط جما لیا اور صدیوں تک پوری دنیا پر سیاست اور ملک گیری کا غلبہ رہا۔

انسان کی تاریخ قبائلِ اوّلین کی معاشرت سے شروع ہو کر قدیم تہذیبوں کے عروج و زوال سے گزرتی ہوئی انسان کے اُس عہد روحانیت تک پہنچتی ہے۔ جس کا نقش ابھی تک دلوں پر باقی ہے۔ اُس زمانے سے لے کر اب تک جو واقعات پیش آئے ہیں اُن میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز اور انقلاب آفریں لمحہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں سائنس کی ایجادات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح پُرانے زمانے کے انسان پتھر کے اوزار بنا کر اور آگ کا استعمال سیکھ کر ایک طویل سفر پر روانہ ہو گئے تھے، اسی طرح صنعتی انقلاب اور مشینی تمدّن کی فتوحات سے ایک نئی تگ و دو کا آغاز ہوتا ہے۔ کیا اس سفر کا بھی وہی انجام ہوگا، ویسی ہی منزلیں

راہ میں آئیں گی ؟ کیا ایک بار اور عظیم الشان تنظیمات کا دَور آئے گا ؟ ایٹمی عہد کے شہر بابل، نینوا اور اُر کی طرح تباہ و برباد ہوں گے ؟ اور غارتِ چمن کے بعد اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد کرنے کے منصوبے باندھینگے؟ پچھلا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ آدمی اپنے ماضی سے سبق لے اور سر پر سے پانی گزر جانے سے پہلے ایک نئے نظامِ حیات اور نئے شعور کی تخلیق کرے۔ اس نظام کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تاریخ کے دوسرے اور تیسرے دَور کی خصوصیات کی یکجائی سے ترکیب پائے گا۔ اس میں رہنے والے لوگ سماج کے سرگرم و مستعد رکن بھی ہوں گے اور اُن میں خلوت نشینوں کی شدّتِ احساس، خود آگاہی اور بلند نظری بھی ہو گی۔ وہ بیک وقت مادّی و روحانی مسرّت کے عطیوں سے بہرہ مند ہو سکیں گے۔ ان میں نہ تو صرف صوفیوں کی سی بے نیازی اور بے تعلّقی ہو گی اور نہ محض ہوسِ نائو و نوش اور حرص و ہوا کا عالم بلکہ ان دونوں سے مختلف ایک تیسرا اندازِ نظر جس کا مظہر مشرقی شاعری کا سرو ہے جو آزاد صفت بھی ہے اور گرفتارِ چمن بھی۔ یا بھگوت گیتا کا کنوَل جو جھیل میں رہتا ہے لیکن پانی سے تر نہیں ہوتا۔ اس مشینی عہد کو ایک ایسے ہمہ گیر فلسفے کی ضرورت ہے جو ان دو بظاہر متضاد مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ اور غالب جیسی

شخصیتوں کا انتظار، جو تازہ و شیریں پھل، اچھی شراب، نکھرے ہوئے موسم اور دوستوں کے خطوں کی لذّتِ انتظار کو زندگی میں اتنی ہی جگہ دے سکیں جتنی نغمگیٔ سروش اور دمسازئی مہر و ماہ کو۔

ابھی تک اس نئے اندازِ نظر کے کوئی واضح آثار نظر نہیں آتے۔ ذہنی طور پر آج ہم اسی مقام پر ہیں جہاں بنی اسرائیل اپنی ہجرت کے فوراً بعد پہنچے تھے۔ ہم ماضی و حال کو تو کوس سکتے ہیں لیکن کسی نئی تعمیر کا نقشہ ہمارے ذہن میں نہیں ہے۔ اِس زمانے کے سب سے طاقتور عقیدے سوشلزم اور بنی اسرائیلی عقائد میں ایک گہری مماثلت و قربت ہے۔ یہودیوں کے اوّلیں صحیفوں میں آزادیٔ نفس، روحانی کشاکش، بخشش اور شخصی نجات کا کوئی تصوّر نہیں۔ بقائے رُوح کا عقیدہ بھی بہت بعد میں جا کر پیدا ہُوا۔ فرد محض معاشرے کا ایک بے نام و نشان ذرّہ تھا۔ خدا افراد کے بجائے قوموں اور قبیلوں سے مخاطب ہوتا تھا۔ اور اُنہیں جزا و سزا کا مستحق سمجھتا تھا۔ خوش ہو کر اُن میں نبی اور بادشاہ بھیجتا، ناراض ہو کر اُن سے دربدر کی خاک چھنواتا۔ انفرادیت پر ملّی اور اجتماعی تخیل کی فضیلت سوشلسٹ نظرّیے کا بنیادی رکن ہے۔ اِس کے علاوہ مادی ضروریات کے معاملے میں بھی سوشلسٹ اور یہودی ہم خیال ہیں۔ یہودی ذہنیت روح اور ضمیر کی جنّت و دوزخ سے متاثر ہونے کی

بجائے جاہ و حشم کی خاطر یا مادّی وسائل کی شادابی و فراوانی کے حصول کے لئے نیکی اور خدا ترسی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پرولتاریہ بھی خدا کے برگزیدہ بندے ہیں۔ لیکن زمانے بھر کے مظلوم و مقہور۔ اُن سے بھی خدا نے زمین کی بادشاہت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تاریخ کا واضح اور روشن ادراک دونوں میں مشترک ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستان دونوں کو ازبر ہے۔ لیکن دونوں عقائد یکساں طور پر داخلی احساس سے تہی اور آزادی کے مفہوم سے نا آشنا ہیں۔

آج مشرق میں اشتراکی ہمہ اوست کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر مغرب میں یہ ہراس طاری ہے کہ کہیں اُس خودی کی قندیل کو جسے انسان صدیوں سے اپنے سینے میں چھپائے پھرا ہے۔ اِس "قلزم صرصر" کی موجیں ہمیشہ کے لئے بجھا نہ دیں۔ فرانس کے فلسفۂ وجودیت[1] میں ازمنۂ وسطیٰ کی پوری رُہبانی ذہنیت جلوہ گر ہے۔ جو زندانِ نفس کی دیواروں سے باہر نہیں جھانک سکتی۔ مغرب کی مصوّری و شاعری بھی محبوس داخلیت کا رنگ اختیار کر چکی ہے کتنی حیرت کی بات ہے کہ مشرق جو ہمیشہ سے داخلیت کا پرستار رہا ہے ایک بے روح اُسلوبِ حیات کو اپنانے کے لئے مضطرب ہے

---

1. Existentialism

اور مغرب اُنہیں بتوں کا قتیل ہے، جن سے وہ عرصے تک دشمنی کرتا رہا ہے۔

خود اپنے منہ سے یہ بات بھلی نہیں لگتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تضاد وکشاکش کا حل اگر کسی کے پاس ہے تو وہ یہی خاک بسر اور مفلوج تہذیب ہے جس کے وارث اِس برِّ عظیم کے رہنے والے ہیں۔ ہمیں نے اِس آویزش کو پورے طور سے سمجھا اور محسوس کیا اور اس سے اوپر اُبھرنے کے راستے دریافت کئے۔ سولہویں اور سترھویں صدی کے صوفیاء ہی کو لیجیے۔ یہ لوگ تزکیۂ باطن میں مشغول رہنے کے ساتھ ساتھ عوام میں گھل مل کر دین کی اشاعت اور اُمرا و سلاطین کی مُشیری کو بھی اپنا فرض جانتے تھے۔ اُردو غزل، جو ہمارے کلچر کی ایک خاص مظہر ہے اسی دورنگی کو ایک اور طرح پیش کرتی ہے۔ اس کی اشاریّت میں داخلی تجربے کا پورا ارتعاش اور تموّج موجود ہے اور اس بے کلی کے ساتھ ساتھ وسعت، ہمہ گیری اور عام فہمی بھی۔ ہمارے زمانے میں اقبالؔ نے اپنے تجزیے سے تہذیب کی اِس کرن کے ساتوں رنگ سامنے نکال کر رکھ دیئے۔ جن واضح الفاظ میں اُس نے خودی کی تکمیل اور ربطِ ملّت کے نصب العین میں توازن و آہنگ پیدا کیا ہے، اس کی مثال اس دَور کے پورے مغربی تفکّر میں نہیں ملتی۔

وزیر آغا نے اپنی اس کتاب میں جن پہلوؤں سے مسرت کے فلسفے اور نفسیات کا جائزہ لیا ہے اس میں ہمیں وہی دو دریاؤں کے سنگم کی سی کیفیت نظر آتی ہے ــــ جیسے گنگا اور جمنا کے ملنے سے سرسوتی جنم لے رہی ہو۔ مصنف نے مسرت کا جو ہمہ گیر تخیل پیش کیا ہے ما اس میں شفق کے بدلتے ہوئے رنگوں کی جھلک اور زندگی کے لمحاتِ گریزاں کا عکس بھی ہے اور ابدیت کی گونج بھی۔ اس کی نظر میں وہ ایک ہی جذبہ ہے، جو کبھی جنسی محبت کا روپ بھرتا ہے اور کبھی جمالیاتی ذوق یا صوفیانہ وجدان کے لبادے میں ظاہر ہوتا ہے۔ محبت، مامورائیت اور حسن وجمال اس کتاب کے تین خاص موضوع ہیں۔ ان تصورات کے تجزیے میں مصنف نے جس بصیرت کا ثبوت دیا ہے وہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔

کتاب کا ایک پورا باب آرٹ سے متعلق ہے اور اس میں جمالیاتی احساس اور تخلیقی عمل کی توضیح پیش کی گئی ہے۔

صوفی کی نگاہ مناظر و اشیا پر نہیں جمتی۔ وہ حسنِ بے حجاب کا تماشائی بننا پسند کرتا ہے۔ اس کے برعکس، فنکار کا کام محض صورت گری ہے۔ بے جان پتھر سے ایسی مورتیاں بنانا جن کی آنکھوں میں شرارے بھرے ہوں اور جن "کا انگ انگ لچکے بل کھائے"۔ فنکار کی شانِ آذری

کسی عام عقیدے، کسی منطق یا بنے بنائے اصول کا سہارا نہیں لیتی۔ اُس کے کام میں ایک اپنا قرینہ ہوتا ہے، ایک اپنی انوکھی منطق۔ اس کی نگاہ ہر شے کو نئے انداز سے دیکھتی ہے۔ لفظوں، رنگوں، یا آوازوں کی دنیا میں ایک نئی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ ہر بار تندیٔ صہبا سے پگھلا ہُوا آبگینہ ایک نئی شبیہہ اختیار کرتا ہے۔ اسی عمل کا نام تخلیقِ فن ہے۔

فنکار کا کام محض یہی نہیں کہ ہم تک اپنی آواز پہنچائے یا اپنے جذبات کی صحیح ترجمانی کرے۔ اُس مقصد سے کہیں زیادہ اہم وہ درخشانی و تابندگی ہے، جو فنکار تاریک و مبہم محسوسات میں پیدا کر دیتا ہے۔ فن کے قالب میں ڈھل کر انسانی جذبات کی ماہیّت یکسر بدل جاتی ہے۔ فن کے معکوس تجربات میں وہ گرانباری، گرفت، اور دم روکنے والی شدّت نہیں ہوتی جو اصلی جذبوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی جگہ کشادگی، سبکساری اور رفعت کا احساس جاگ اُٹھتا ہے جو ذہن کو گردِ وپیش کے سلاسل سے نجات دلا کر ایک بلند تر شادمانی سے ہم کنار کر دیتا ہے۔

فن کی جاذبیّت کا ایک اور سبب اس کی وہ دو رنگی خصوصیت ہے جو اپنے اندر بیک وقت تموّج و سکون، ارتعاش و آسودگی، شعلہ و شبنم کی کیفیات سموئے رکھتی ہے۔ ہر فن پارہ خواب اور نشے کا ایک عجیب وغریب

امتزاج پیش کرتا ہے۔ خواب کا تعلق، تخیلات کی نزاکت اور حسن سے ہے۔ اُن کی بوقلمونی اور فراوانی سے، نیرنگِ نظر اور حیرتِ تماشا سے۔ نشہ فقط تپش واضطراب، خود آرائی و خود فریبی، ہنگامہ و شوریدہ سری، رقص اور راگ رنگ کا دوسرا نام ہے۔ نشے کی کثافت، گراں نشینی اور حدّت کس طرح خواب کی مافوقیت سے نمو پاکر اعلےٰ فن کو جنم دیتی ہے؟ نفسیاتِ جمال ابھی تک اس عمل کو پوری طرح بیان نہیں کر پائی۔ اس کتاب کے مصنّف نے " آرٹ اور مسرت " کے زیرِ عنوان اس سلسلے میں بعض خیال افروز باتیں کہی ہیں، جو غور و فکر کی محتاج ہیں۔ جس فعل کو ذہن کا عمل رابطہ کہتا ہے۔ یہ وہی لمحاتی لمس ہے، جو پیاس سے جلتے ہوئے لبوں اور پہاڑی چشمہ کے سرد و شیریں پانی کے مابین پیدا ہوتا ہے۔ یہ لمس صرف تخلیقِ فنّ و ادب ہی کا محرّک نہیں۔ انسانی فکر و نظر کی دوسری شمعیں بھی اسی لمحۂ حیات افروز کے فیضان سے روشن ہیں۔

صوفیانہ تصوّرات کا انسان کے ذہن پر اتنا ہی گہرا اثر پڑتا ہے جتنا فنّ و ادب کے کارناموں کا، یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ انسان اور کائنات کا باہمی رشتہ اِتنا ہی حقیقی ہے جتنا جنس کا یا روٹی کا سوال۔ پھر اس مسئلے سے اتنا گریز کیوں؟ اتنی پردہ پوشی کیوں؟ انسان اپنی ذات اور اجزائے آفرینش میں کیسے ربط و ہم آہنگی تلاش کرتا ہے؟ اس کے روحانی اور

جمالیاتی تقاضوں کی نوعیّت کیا ہے ؟ زندگی کی وحدت و یکتائی کا احساس ذہن پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے ؟ ان سب سوالوں سے جدید علوم اور بالخصوص جدید نفسیّات نے جس طرح اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی ہے اس سے ایک گہرا اعصابی خوف جھلکتا ہے۔ نفسیّات انسان کو مرکزی حیثیت بخشتی ہے اور ایسے تجربات کا تصوّر کرتے ہوئے جھجکتی ہے جو احساس خودی سے عاری ہوں۔ لیکن ہر زمانے میں ایسے لوگ گزرے ہیں۔ جنہوں نے شخصی وجود کی اضافیت کو محسوس کیا اور قطرہ کو دریا سے ہمکنار کر ڈالنے میں عمریں بتا دیں۔ ان تجربات کا سنجیدہ مطالعہ نفسیّات کو ایک نئے انداز فکر سے روشناس کراتا ہے۔ یہ خیال پختگی پکڑنے لگتا ہے۔ کہ نفس ایک وسیع و بسیط ارتقائی عمل کی محض ایک منزل، محض ایک ماندگی کا وقفہ ہے۔ اس کی کوئی دائم و قائم ازلی اور اساسی حیثیت نہیں یہ مفروضہ نفسی حقائق کا بالکل نیا تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ لیکن شاید ہم ابھی تک اس انقلاب کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ وزیر آغا نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے ان تجربات کی توجیہہ کی ہے لیکن ان کے مطالعہ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے اس میں غیر ضروری قطعیّت، ہٹ دھرمی اور بے جا خود اعتمادی نہیں۔ ممکن ہے کہ ان کا یہ پہلا قدم ایک دن ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لے اور

ہم اِن مسائل کے متعلق ایمانداری اور سچّائی سے سوچنا شروع کردیں۔ جن کے ذکر سے بھی آج کل بہت سے پڑھے لکھے لوگ کتراتے ہیں۔

تصوّف اور پرستشِ جمال میں ایک قدرِ خاص مشترک ہے۔ صوفی کی بے خودی اور فن کار کی انتہائی خود بینی و خودرائی ظاہر میں متضاد کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن حقیقتًا فن کار اور صوفی دونوں ایک مقصد کے لئے جیتے ہیں —— ایک ایسی حالتِ جذب کے لئے جس میں ذات اور غیر ذات کا امتیاز نہ باقی رہے اور مکمل خود فراموشی میسّر ہو لیکن عشق مَن و تُو کے احساس کو مٹانے کے بجائے اسے شدید تر کر ڈالتا ہے تلاشِ حق اور تلاشِ جمال کی طرح محبّت کا بنیادی محرّک بھی انسان کا تنہائی اور بے بسی کا احساس ہے۔ لیکن عاشق، صوفی اور فنکار کی طرح اِس حدِّ فاصل کو فراموش نہیں کرتا جو ایغو کو کائنات سے جدا کرتی ہے۔ عشق کی تکمیل کے لئے محبوب کا جسمانی وجود لازمی ہے۔ لیکن عاشق کے لئے جنسی جذبہ محض ایک وسیلہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی زبان، جسے دنیا بھر میں صرف دو ہی آدمی بول سکتے ہوں۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ جب دو آئینے ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیئے جائیں تو عکسوں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ بنتا چلا جاتا ہے اور آپ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ آخری عکس کونسا ہے۔ یہی عشق کی

کیفیت ہے ۔ کوئی بات بھی آخری بات نہیں ۔ جنسی لذت ہوس کی انتہا ہے ۔ اور عشق کی ابتدا ۔ اس کتاب کے مصنف نے جہاں فلسفیانہ طور پر محبت کی تقسیم کی ہے ، وہاں ان بندشوں اور الجھنوں کا بھی ذکر کیا ہے جو آئے دن مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کو تلخ اور بے کیف بناتی رہتی ہیں ۔ عام طور پر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ سیدھے خط صرف انسان اپنے ہاتھ سے کھینچتا ہے ۔ فطرت میں تو ہر طرف لہروں کا سا اُتار چڑھاؤ ہے ۔ ایک صوتی آہنگ ، جو کبھی نرم اور نازک ہے اور کبھی تُندوتیز ۔ سب سے بڑی بات یہی ہے کہ آدمی اس نعاپ کو پورے طور سے جانے اور اس سے قدم ملائے رہے ۔ مرد اور عورت کی چاہت میں بھی یہی زیر و بم ہے ۔ دھوپ چھاؤں کا منظر ۔ جنسی کشش اور طلب کے ساتھ ساتھ گریز اور فرار کا جذبہ بھی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے اور مسرت کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ چاہنے اور چاہے جانے والے اس حقیقت سے کبھی بے خبر نہ ہوں ۔ محبت اور مسرت کے عنوان سے مصنف نے اس موضوع پر ایک پورا باب لکھا ہے ، جو محض نظریاتی لحاظ سے ہی دلچسپ نہیں بلکہ وہ ہماری اور آپ کی زندگی سے نہایت قریب ہونے کے سبب ایک نفسیاتی مشورہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔

اس کتاب کے پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے ۔ کہ مصنف کے افکار و

نتائج محض کتابی مطالعہ اور غور و فکر کی پیداوار نہیں ۔ اس کاوش میں ان کے ذاتی حالات اور اِن حالات سے اُبھرنے والے اندازِ نظر کو بہت دخل ہے ۔ اس لئے ان کا شخصی تعارف کرائے بغیر یہ دیباچہ نامکمّل رہ جائے گا ۔ جب وزیر آغا نے پہلے پہل مجھ سے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ مسّرت کے موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنا چاہتے ہیں تو مجھے یہ سمجھنے میں دشواری ہوئی کہ اُنھوں نے اس موضوع کا کیوں انتخاب کیا ہے ۔ اس موضوع کی ادبیّاتِ حاضرہ میں کوئی روایتی حیثیت نہیں اور نہ ہنگامی لحاظ سے یہ موضوع کوئی مقبولیت رکھتا ہے ۔ وہ زمانہ گیا جب لوگ کسی بنیادی بات کا ذکر بے جھجک چھیڑ دیا کرتے تھے ۔ اور سیدھے سادے انداز سے بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے ۔ لیکن ایک بار جب مَیں اِن کے گاؤں میں جا کر رہا تو مجھے اِس سوال کا جواب مل گیا ۔ واپس آتے ہوئے میں نے یہ سوچا کہ وہ باتیں جو وزیر آغا نے اپنے مقالوں میں علمی اور غیر شخصی انداز سے کہی ہیں ۔ اِن کے کہنے کا ایک اور طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے گاؤں کے متعلق ایک ناول لکھتے ۔ غالباً اس مختصر سے قیام کے تاثّر کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے کی خاطر ہی میں دوبارہ اُن کے گاؤں نہیں گیا ۔ اس گاؤں کے متعلق تفصیل سے کچھ لکھنا میرے لئے ناممکن ہے ۔ یوں سمجھ لیجئے یہ زندگی بیک وقت

خاموش بھی ہے اور متلاطم بھی۔ اور اس سے وابستہ ہر شخص ایک مکمل فلسفۂ حیات کا نمائندہ ہے اور ایک مشین کی طرح اپنے مسلک کا اعلان کئے جا رہا ہے۔ اس پورے ماحول میں وزیر آغا ہی ایک ایسا انسان ہے جو کسی نظریہ کا تابع نہیں، جو خاموشی سے سب کچھ سنتا ہے، جو محض ایک غیر مخل اور صاحب بصیرت تماشائی ہے۔ بڑے آغا صاحب اور کریم بخش کے ساتھ ایک دوپہر میرے حافظے میں ہمیشہ روشن رہے گی۔ بڑے آغا صاحب ویدانت پر غیر معمولی طور سے حاوی ہیں اور جس طرح وہ درخت کے نیچے بیٹھے سیدھی سادی پنجابی میں اپنے مزارعوں کو اس نظریہ کی تلقین کرتے ہیں وہ منظر اس بیسویں صدی میں غیر حقیقی سا نظر آتا ہے۔ کریم بخش محض ایک دہقان ہے۔ میں نے اس سے خیر و شر کے متعلق پوچھا تو اس نے صرف اتنا کہا "برائیاں اگر لوہے کی بیڑیاں ہیں۔ تو نیکیاں سونے کی بیڑیاں ہیں۔" اس گاؤں کے بعض کرداروں کا ذکر آپ کو اس انوکھی کتاب میں ملے گا۔ شمس آغا مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کے متعلق غالب نے کہا ہے ؎

کیا پوچھو ہو وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

چڑت رام اور دلاور خاں اپنی اپنی جگہ مکمل انسان ہیں۔ وزیر آغا

اپنی صبح ملسلٹے کے باغوں کی دیکھ بھال میں صرف کرتے ہیں، واپس آکر زمینداری کا حساب کتاب دیکھتے ہیں۔ یا مردانے میں بیٹھے کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ اور شام کو ان پگڈنڈیوں پر ٹہلتے گھومتے ہیں جن کی گرد ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں سونے کے ذرّوں کی طرح چمکتی ہے۔

یہ ہے وہ زندگی، جس نے اِن خیالات کو جنم دیا۔ جو ایک سادہ مگر دلکش نگارش کے سِلسلۂ زرّیں میں آپ کے پیشِ نظر ہیں +

وجیہ الدین احمد

مسرّت

مسرّت ــــــ ؟ یہ سوچنا غلط ہے کہ زیادہ آسائش زیادہ مسرّت کا منبع ہے۔ مسرّت آتی ہے گہرے طور پر محسوس کرنے سے، سادگی سے لطف اندوز ہونے سے، تخیّل کی آزاد اُڑان سے، زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے، دوسروں کے کام آنے سے ــــ سٹارم جیمیزسن کے ان الفاظ کی صداقت پر کیسے شبہ ہو سکتا ہے لیکن زندگی اس قدر بسیط ہے اور اس کی اقدار اتنی پیچیدگیوں کی حامل کہ اس کے متعلق کوئی بھی سطحی بیان تسکینِ قلب کا موجب نہیں بن سکتا۔ اور چونکہ اس کلبلاتے ہوئے دَور میں خوشی اور غم کا لاینحل مسئلہ ایک باقاعدہ مرض کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ لہٰذا اس پر ایک گہری نظر ڈال کر کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی کمزور سے کمزور سعی بھی باعث مسرّت ہو سکتی ہے ــــ مسرّت! وہی مسرّت

جسے میں نے اپنے مطالعہ کا عنوان کیا ہے۔

لیکن مسرت آخر ہے کیا؟ اور کس حد تک اسے غم سے متمیز کیا جا سکتا ہے؟ اگر علم النفس کی جدید ترین تحقیقات محبت اور نفرت کو ایک ہی تصویر کے دو رُخ قرار دے سکتی ہیں۔ اگر ان تحقیقات کی روشنی میں احساسِ برتری اور احساسِ کمتری کے مابین صرف ایک لطیف سا پردہ ہی حائل ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خوشی اور غم کی سرحدیں بھی پھیلتی پھیلتی ایک دوسرے میں مدغم نہ ہو گئی ہوں۔ اور ہمارے لئے اُن کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا ایک مصیبت بن گیا ہو...... مگر حدِ فاصل تو قائم ہے ہی! مسرت غم نہیں ہو سکتی اور غم مسرت نہیں ہو سکتا۔ یہ دو مختلف کیفیات ہیں جن میں سے ہر ایک انسانی زندگی کے تاروں کو اتنی شدت سے مرتعش کرتی ہے کہ انسان لرز اٹھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک اپنے ارتقا میں شگفتگی اور والہانہ پن کے سہارے بہتی ہوئی زندگی کو ایک نشاط انگیز رقص میں تحلیل کر دیتی ہے اور دوسری اپنی انتہا میں اس کا ہاتھ پکڑ کر ایسی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے جہاں تیرگی اور بے بسی کے شدید احساس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ہاں! مگر ایک بات واضح ہے، اور وہ یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی کیفیت بھی ابدیت کی حامل نہیں اور نہ اس کا وجود دوسری کے قطعی استیصال ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔ مسرت کا مزہ کچھ وہ ہی جانتا ہے جس نے غم کی چاشنی کو بھی چکھا ہے اور غم کی خلش کچھ اُسے ہی ستاتی ہے جس نے مسرت و نشاط کا جام بھی پیا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں

اور زندگی نام ہے اُس دوڑ کا جو اِن دو سرحدوں کے درمیان ازل کے روز سے جاری ہوئی اور ابد تک جاری رہے گی۔

اب تجربہ اور تاریخ شاہد ہیں کہ انسان روز آفرینش ہی سے مسرت کا طالب رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت جن مستثنیات کے تابع ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض لوگ مسرت کے نہیں بلکہ غم کے جویا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خود اذیتی (MASOCHISM) کے تحت اپنی ذات کو دُکھ میں ڈال کر حظ اُٹھاتے ہیں۔ اور قنوطیت کے پیہم تھپیڑے سہہ سہہ کر اِس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اُن پر تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اس زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو غم کو مثبت (POSITIVE) تصور کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے مطابق مسرت بذات خود کوئی چیز نہیں یہ صرف غم کے فقدان کا نام ہے۔ اپنے اسی خیال کو زیادہ صاف الفاظ میں وہ یوں ادا کر جاتے ہیں کہ مسرت ایک سیاہ بلّی ہے جسے کوئی اندھیرے کمرے میں ڈھونڈھ رہا ہے۔ جب کہ وہ وہاں نہیں ہے اور اسی زمرے میں ان لوگوں کے نام بھی شامل ہیں، جنھوں نے اپنے اوپر گھناؤنی زندگی کی ساری صعوبتوں کو روا رکھ کر دوسروں کے لیے میدان صاف کیا اور خود چپ چاپ، ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ابدی تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ چارلس ڈکنس کے مشہور و معروف کردار سڈنی کارٹن کی لازوال قربانی کی مثال دی جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم اس کردار کے اُن آخری الفاظ کو یاد رکھیں کہ "یہ کتنا نفیس قدم ہے جو میں اُٹھا رہا ہوں۔ اُن سے ہزار گنا اچھا جو میں نے آج تک اُٹھائے

ہیں ہیں ایک ایسے سکھ اور آرام کی طرف گامزن ہوں جس سے میں آج تک محروم رہا!" ـــــ نفسیاتی لحاظ سے بھی یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ ہم اکثر ٹریجڈی کو کامیڈی سے زیادہ وزنی قرار دیتے ہیں اور مقدم الذکر کی تاریک فضا میں ہمیں وہ تسکین حاصل ہوتی ہے جس کی فی الواقعہ ہمیں ضرورت ہوتی ہے لیکن ان تمام مثالوں میں جس اہم نکتہ کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ غم دُکھ قربانی اور ٹریجڈی سے دراصل وہی مسرّت حاصل کر لیتے ہیں جس کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ ان چیزوں کی طرف راغب ہو گئے تھے۔

چنانچہ فی الحقیقت ہر انسان مسرّت کی تلاش میں ہے مگر اس سے قبل کہ میرے اس فقرے سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے میں مسرّت اور لذّت کے مابین حدِّ فاصل کی اُن لکیروں کو شوخ کر دینا چاہتا ہوں جو ان دونوں کیفیات کو نمایاں کر سکیں۔ لذّت ایک حیاتی چیز ہے اور اُس کا زیادہ تر تعلق جسم سے ہے۔ ہم اپنی پانچ حسّیات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سونگھنے سے، چکھنے سے، چھونے سے، سننے سے اور دیکھنے سے ـــــ اور جتنا ان میں سے کسی لطف کا جسم کے ساتھ زیادہ تعلق ہوگا اتنا ہی وہ مسرّت کی بہ نسبت لذت سے زیادہ نزدیک ہو جائے گا۔ آسمان کی نیلی سی جھیل میں تیرتے ہوئے بادل کے ایک تودے کو دیکھ کر یا موسیقی کی کسی مدھر الاپ کو سن کر یا کسی ایسی ہی کیفیت سے جو مسرّت کی ایک ہلکی سی موج ہمارے سراپا سے ٹکرا کر پھر غائب ہو جائے گی ما اُس لذّت سے کافی مختلف ہوگی جو مثلاً

کوک شاستر کی کسی برہنہ تصویر کو دیکھ کر یا کباب کا ایک ٹکڑا کھا کر حاصل ہو سکتی ہے لیکن شاید میری دلیل ابھی تشنہ ہے زیادہ واضح الفاظ میں مسرت اور لذت میں وہی تفاوت ہے جو محبت اور شہوت میں ہے، تخیل اور حقیقت میں ہے، روح اور جسم میں ہے۔ مسرت، لذت ہی کی ترقی یافتہ صورت کی مظہر ہے۔ لذت جسم سے وابستہ ہے، مسرت روح سے متعلق ہے۔ لذت انسانی حیات کی مرہونِ منت ہے۔ مسرت اُن روحانی کیفیات کے تابع ہے۔ جن کا محرک کوئی خارجی منظر ہوتا ہے۔ لیکن جو روح کی کسی غیر محسوس لہر سے جنم لیتی ہیں۔ اور اگرچہ یہ چیز بسا اوقات صرف چند لمحات سے زیادہ پائدار نہیں ہوتی لیکن ان چند لمحات میں وہ زندگی کو اتنا کچھ بخش جاتی ہے۔ جو بیش بہا خزانوں پر بھی بھاری ہوتا ہے اس سلسلے میں امریکہ کے ایک مشہور جریدے[1] کے ایک بلند پایہ مضمون کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔ جس میں اُس مریض کے چند نہایت پُر مسرت لمحات کا بیان ہے جو اس نے تندرست ہونے کے بعد یکلخت محسوس کئے جب کہ اُسے بالکنی میں ایک پلنگ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اور اس کے سامنے ایک کُھڑے سے درخت پر بہار کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ یا پھر ہم اس مسرت کو شیلے کے اس زندہ جاوید مصرعے سے پھوٹتا ہوا دیکھ سکتے ہیں کہ ؎

I SHRIEKED AND CLASPED MY HANDS IN ECSTACY

[1] READER'S DIGEST

اسی طرح شمس آغا کے مشہور افسانے "سراب" میں بھی ایک جگہ ہیرو خارجی مناظر کے ٹکراؤ سے مسرت کی ایک ایسی ہی والہانہ لہر محسوس کرتا ہے —— " وہ رُک گیا اور چاند کا چہرہ کانپتے ہوئے پانی میں جھلملانے لگا۔ اُس کا دل چاہا وہ فرطِ کیف سے چیخیں مارے —— درخت بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ جھاڑیاں دم روکے ہوئے تھیں، لانبی لانبی گھاس میں نمی آگئی تھی۔ چاروں طرف جمود تھا۔ اور خاموشی —— ہاں دُور کہیں دُور، ٹیلوں پرے کوئی بنسری بجا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ پتھر پر کھڑا ہو کر بنسری بجانے والے کو آواز دے، اُسے اپنے پاس بُلائے —— یا خود بنسری بن کر اس کے جاگتے ہوئے لبوں سے جا لگے۔ اور نغمہ بن کر کائنات کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے!" —— آپ نے دیکھا، مسرت کی یہ لہریں کتنی تیز رفتار ہیں۔ اور انہوں نے کس طرح ان محسوس کرنے والوں کی روحوں کو مرتعش کر دیا ہے۔ زندگی میں ایسے لمحات بہت کم آتے ہیں ورنہ بیشتر اوقات تو روح کی پرواز ماحول کی سنگین دیواروں ہی میں پھڑ پھڑا کر رہ جاتی ہے۔

مگر مسرّت کی اس توضیح کے بعد یہ کہنا کہ ہر انسان اسی مسرت کی تلاش میں ہے غالباً صحیح نہیں ہوگا۔ مسرت کی ان پُر زور لہروں کو پانے کی شعوری یا غیر شعوری آرزو ہر انسان کے ذہنِ رسا کی منزل نہیں —— لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک عام انسان مسرت کی اُن ان گنت چھوٹی چھوٹی لہروں کا تمنائی ضرور

ہوتا ہے۔ جو لذت، سکون اور تکلیف کے مدوجزر سے پیدا ہوتی ہیں ـــــ علاوہ ازیں چونکہ "تکرار" سے ان میں سے ہر کیفیت کی شدت میں انحطاط لازم آتا ہے اور چونکہ یہی تکرار آگے چل کر یکسانیت اور ٹھہراؤ کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بھی آرزو کرتے ہیں کہ زمانے میں تغیر کو ثبات رہے اور لذت، سکون اور تکلیف کا مدوجزر قائم رہے ـــــ دراصل ہم انسان فطری طور پر تلوّن پسند ہیں۔ ہم تبدیلی چاہتے ہیں چاہے یہ تبدیلی احول میں ہو جسم میں یا خیالات میں اور فی الحقیقت اگر ہماری زندگی ایک ٹیڑھی لکیر نہ ہوتی تو ہم کبھی کے اس سے اُکتا گئے ہوتے، اُکتا کر بیزار ہو چکے ہوتے۔ مگر بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی جسمانی اور ذہنی تبدیلیوں سے دوچار ہو کر اور گردشِ فلک اور ماحول کے نت نئے انقلابوں کے طفیل ہم نے خود کو ایک جمود، تعطل اور زندگی کی سنگلاخ یکسانیت سے بچا لیا ـــــ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان صرف سکون کی تلاش میں ہے بعض کا خیال ہے کہ اُسے صرف لذت چاہیئے، بعض ٹریجڈی کو اُس کی منزل قرار دیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت انسان ان میں سے کسی بھی خاص کیفیت کا جویاں نہیں ـــــ وہ تو زندگی کے اس مدوجزر کا جویا ہے کہ جس کے طفیل وہ مسرت کی ہلکی ہلکی لہروں سے مستفید ہو سکے۔ وہ تو زندگی کے ایک ایسے سمندر کی تلاش میں ہے جس میں طوفان کبھی آئے اور جس پر سکوت بھی طاری ہو۔ لیکن جس کی سطح پر ننھی منّی لہریں ضرور مچلتی رہیں ـــــ بڑے پیمانے

پر بھی اگر ہم دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اگر فرد کی زندگی لامتناہی ہوتی تو اس زندگی کا سارا حسن، کشش، اور والہانہ پن، اس کی کرختگی اور یکسانیت میں تحلیل ہو کر رہ جاتا اور حیات و موت کی دھوپ چھاؤں سے محروم ہو کر زندگی خود سپاٹ اور چٹیل ہو جاتی۔ غالب نے بھی کہا ہے نا کہ

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اور اگر ہم اس منطق کو تسلیم کر لیں کہ انسان ٹھہراؤ اور یکسانیت سے کنارہ کش ہونے کا آرزومند ہے تو ہمیں زندگی کے ہر اس نظام کی پائداری پر شک گزرے گا۔ جس میں مد و جزر کے امکانات صفر کے برابر ہوں گے۔ اور شک کیوں نہ ہو جب کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان غم کو برداشت کر سکتا ہے لیکن یکسانیت اور ٹھہراؤ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ایمرسن ایک جگہ لکھتا ہے "ہم خوبصورتی میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن اسے دیکھنے کے لئے ہمارے پاس آنکھیں نہیں" ——— آنکھوں سے اس کی مراد دل کا وہ میلان RESPONSE ہے جس کے طفیل کائنات کا حسن حقیقت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ خوبصورتی کو دیکھنے کے لئے ایک حساس دل کی ضرورت ہے۔ ورنہ بیشتر لوگ تو جمالی کیفیات سے اس درجہ اجنبی ہوتے ہیں کہ کوئی خوبصورت منظر بھی ان کی روحوں کو بلند نہیں کر سکتا اور وہ مادیت کے قصر سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکل

سکتے۔ اس ضمن میں اُن سیّاحوں کا تذکرہ بھی غیر مناسب نہیں۔ جو پہاڑوں پر صرف تاش اور کیرم کھیلنے اور پوسٹ آفس کے سامنے کھڑے ہو کر چلغوزے اور بادام کھانے کے لئے جاتے ہیں ـــــ ایسے لوگ مسرّت سے محروم رہتے ہیں البتہ اس محرومی سے گھبرا کر زیادہ سے زیادہ جسمانی لذت حاصل کر لینا چاہتے ہیں ـــ فی الحقیقت خوبصورتی کو دیکھنا' دوسروں کو دکھانا اور اس سے لطف اندوز ہونا ایک بہت بڑی بات ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ انسان کسی بھی چیز کو ایسی دلچسپی سے دیکھے گویا اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ یوں کرنے سے ایسی نئی نئی باتیں اُس پر منکشف ہوں گی، جنہیں وہ سطحی نظر میں نظر انداز کر گیا تھا۔ دراصل' جدّت اور تبدیلی ہی تو مسرّت کے سب سے بڑے معاون ہیں! وہ خوبصورتی جو مسرّت کی مستقل رفیق ہے، بذاتِ خود ایسے رنگوں کا امتزاج پیش کرتی ہے جو ہر آن بدلتے رہتے ہیں اسی طرح اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں محسوس ہو گا کہ تمام کائنات بھی ہر لحظہ تبدیل ہو رہی ہے۔ اس میں نیا پن آ رہا ہے۔ صرف گہری نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ کیوں سردی کے بعد بہار آ جاتی ہے اور بہار کے بعد گرمی! کائنات کی دوسری اہم تبدیلیوں سے قطع نظر اگر محض یہ موسمی تبدیلیاں ہی معرض وجود میں نہ آتیں تو ایک یکسانیت اور ٹھہراؤ کے ماحول میں ہمارے خیالات اور احساسات میں بھی تعطل اور جمود پیدا ہو جاتا اور ہر چیز پر ایسی گھٹن کی فضا کا تسلط ہو جاتا جو زندگی کے لئے مہلک ثابت ہوتی۔

ایک مشہور انشا پرداز نے زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ خواہشات، انسانی فطرت کا ضروری جزو ہیں۔ انسان خواہش کرتا ہے اور اپنے افکار و احساسات کے لیئے ایک منزل متعین کر لیتا ہے۔ تب وہ اس منزل کے لئے کشاکش اور تگ و دو میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن جب وہ منزل پر پہنچ جاتا ہے تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ اس منزل نے تو اُسے وہ تسکین ہی مہیا نہیں کی جس کا وہ طالب تھا۔ دراصل اسی دوران میں اس نے ایک نئی منزل کی طرف اپنے احساسات کے دھارے کو موڑ لیا تھا —— غم زدہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو یا تو زندگی کے اتنے نچلے مقام پر کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ انہیں اپنی خواہشات کی تکمیل کی امید ہی نہیں ہوتی اور یا وہ لوگ جو زندگی کے اس زینے کے اُس اوپر والے تختے پر کھڑے ہوتے ہیں کہ جہاں انہیں زندگی کی ساری سہولتیں مل جاتی ہیں اور انہیں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کوئی بھی کشمکش نہیں کرنا پڑتی —— کشاکشِ حیات کے متعلق یہ خیالات حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور میرے استدلال کے سلسلے کو اس حد تک تقویت پہنچاتے ہیں کہ مسرت کی اَن گنت چھوٹی چھوٹی لہروں سے مستفید ہونے کے لئے جس کش مکش اور تگ و دو کو میں نے ضروری متصور کیا تھا، اُسے یہ بھی ناقابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

اب اگر ہم ذرا اور گہری نظر سے دیکھیں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ زلیست کے

صحرا میں مسرت ایک ایسی عمارت ہے جو تین عظیم الشان ستونوں پر کھڑی ہے۔

الف معصومیت

ب صحت

ج خواب

جہاں تک معصومیت کا تعلق ہے یہ بات قابل غور ہے کہ ذہنی ترقی اور معصومیت ایک دوسرے کی ضد ہیں یعنی جہاں ذہنی ترقی کا آغاز ہونے لگتا ہے وہاں معصومیت فنا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اب چونکہ ذہنی ترقی سے رازہائے سربستہ فاش ہوتے ہیں اور چونکہ رازہائے سربستہ ہی زیست کو خوشگوار اور پرکشش بنانے کے محرک ہیں۔ لہٰذا جب "راز" کے پٹ کھل جاتے ہیں تو زندگی سپاٹ اور چٹیل نظر آنے لگتی ہے اور اس سے مسرت حاصل کرنے کے امکانات رو بہ زوال ہو جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہم برضا و رغبت زندہ ہی اس لئے ہیں کہ کائنات ایک ایسا سربستہ راز ہے جس کو افشا کرنے کے لئے ہمیں زندگی بھر ایک کبھی نہ ختم نہ ہونے والی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔

بچپن میں ہمارے لئے گھر کے دروازے کے باہر ایک جہانِ عجیب بستا ہے۔ جب ہم ذرا بڑے ہو جاتے ہیں تو ہمارا تجسس افق کی پہاڑیوں کے پار ہمیں لے جانے کے لئے اکساتا ہے، پھر ہم سمندروں کو عبور کر کے ان کے پرے کی عجیب و غریب دنیا کو دریافت کرنے کے متمنی ہو جاتے ہیں اور ایک وقت

ایسا بھی آتا ہے کہ ہماری متجسّس نظریں اس دنیا سے ہٹ کر اجرامِ فلکی کے سربستہ رازوں کو فاش کر دینا چاہتی ہیں ــــ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی تجسّس، اسی تگ و دو کا نام زندگی ہے اور یہ وہی زندگی ہے جو مسّرت کی سب سے بڑی معاون ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ جوں جوں انسان ارتقا کی منازل طے کرتا جاتا ہے اور اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے جہانِ رنگ و بُو کی لطافتوں اور کثافتوں کا تجزیہ کرنے لگتا ہے توں توں اُس پر افسردگی کا غلبہ بھی بڑھنے لگتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرتِ انسانی لطافت کو کثافت پر ترجیح دیتی ہے، خواب کو حقیقت سے زیادہ پائدار اور مسّرت انگیز تصوّر کرتی ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ ایک مذہبی رہنما ایک سائنسدان کی بنسبت زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس لئے کہ سائنس زندگی کی کرختگی اور ٹھوس پن کو عریاں کرتی ہے اور بڑے ہی حزم و احتیاط سے .... حیات کے معموں کو حل کرتی چلی جاتی ہے لیکن اس کے برعکس مذہب کائنات کے محمل کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے رازوں کی ان گنت چلمنیں باندھ دیتا ہے اور ان چلمنوں پر تشبیہوں اور استعاروں کی چمک دار جھالریں آویزاں کر دیتا ہے ــــ اور انسان ــــ ظاہری شان و شوکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے والا انسان چُپکے چُپکے اور خوشی خوشی اپنی گردن بڑھا کر رسوم و قیود کے طوق و سلاسل پہن لیتا ہے ــــ پھر بھی وہ اس قید کو اُس

آزادی پر ترجیح دینے میں اس لئے حق بجانب ہے کہ مقدم الذکر اُسے مسرت مہیا کرتی ہے اور آخر الذکر ایک سنگلاخ اور کرخت حقیقت۔

اور یہی وجہ تھی کہ میں نے معصومیت کو مسرّت کا ستون قرار دیا تھا۔ اگرچہ مجھے اس بات کا بڑا احساس تھا کہ یہ لفظ خاصا مبہم ہے اور چند، غلط فہمیوں کا موجب بن سکتا ہے۔ دراصل معصومیت سے میری مراد دل کی وہ کیفیت تھی جب کہ سارا جہان ایک طلسمِ ہوشربا نظر آئے اور دل اسے حل کرنے کے لئے متجسس ہو۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک معصوم بچّہ یا گنوار ایک جہاندیدہ بوڑھے یا ترقی یافتہ انسان سے کہیں زیادہ مسرّت حاصل کرے گا۔ اگر مثال کے طور پر اُسے پہلی بار ریل گاڑی یا جہاز میں چڑھنے کا موقعہ میسّر آئے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں خلا کا احساس دُکھ کا موجب ہے۔ ایک بچے یا گنوار کے لئے زمین کے نیچے آسمان سے اُوپر اور زمین اور آسمان کے مابین، ہر چیز ایک پُر اسرار دھندلکے میں ملفوف ہے وہ اپنے محدُود فکر و تخیّل کی اعانت سے ان میں سے ہر چیز کا ادراک کرتا ہے اور جب ان میں سے کوئی بھی شے عُریاں ہو کر اس کے سامنے آتی ہے تو اُسے وہ مسرّت حاصل ہوتی ہے جس پر ہم ترقی یافتہ انسان بھی رشک کر سکتے ہیں۔ معصومیت اور جہالت (جہالت جس سے میری مراد زندگی کے رازہائے سربستہ کی بہتات ہے) کے الفاظ یہاں ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں۔ اور نتیجہ وہی نکلتا ہے جو ہم نے شروع میں نکالا تھا یعنی راز MYSTERY کا وجود مسرّت کا موجب ہے۔ یہاں البتہ ہم اس

بات کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔ کہ رازِ معصومیت کا مرہونِ منت ہے اور کہ معصومیت ایک ایسی چھوئی موئی ہے، جسے ایک بار گنوا کر ہم پھر نہیں پا سکتے۔ ہمارا جو قدم ارتقار کی طرف اُٹھ جاتا ہے وہ واپس نہیں پلٹ سکتا ـــــ البتہ ذرا احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے یہاں اس بات کا بھی اظہار کر دینا چاہیئے کہ میں مسرت حاصل کرنے کے لئے جہالت کا علمبردار نہیں ہوں بلکہ میری یہ آرزو ہے کہ انسان اگر وہ خوشی کا جویا ہے، تو اُسے ارتقا کے باوجود معصومیت کا دامن نہیں چھوڑنا ہو گا۔ بلکہ ہر شے کو اس نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا ہو گی۔ گویا اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

مسرت کے دوسرے بڑے ستون "صحت" کا تذکرہ کرنے سے قبل میں معصومیت کی مندرجہ بالا بحث کو ختم کرتے ہوئے اس کے متعلق اپنے مجموعی تاثر کو بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں کہوں گا کہ معصومیت بچپن کا طرۂ امتیاز ہے لیکن یہ جوانی میں بھی اپنی شان کو قائم رکھتی ہے۔ اگر بچہ اپنی نکھری ہوئی معصومیت کے طفیل مسرت کی مچلتی ہوئی موجوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے تو جوان بھی اپنے اطوار میل جول، کاروبار حتیٰ کہ محبت میں خلوص کی اُس بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ جو معصومیت کا دوسرا نام ہے۔ اسی خلوص سے اُسے مسرت کا خزینہ ملتا ہے لیکن جب دنیا اس کے اس خلوص کا جواب فریب سے دیتی ہے اور اُسے تجربات و حوادث سے دنیا کی عیاری اور مکاری کے راز معلوم ہونے لگتے ہیں تو آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر وہ بھی ہر شے کو شک اور خوف کی نظروں سے دیکھنے لگ جاتا ہے

یہ شک اور خوف زیادہ مہذب الفاظ میں "جہاندیدگی" کہلاتا ہے۔ یہ جہاں دیدگی ادھیڑ پن میں پروان چڑھتی ہے اور بڑھاپے میں خطرناک صورت اختیار کر جاتی ہے البتہ اس جہاندیدگی کے طفیل انسان مسرت کے ان معطر جھونکوں سے بتدریج محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جو اس کے خلوص اور معصومیت کی پیداوار تھے۔

معصومیت کے بعد مسرت کے دوسرے بڑے ستون 'صحت' کی باری آتی ہے اب صحت اور مسرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے بلکہ ان کا رشتہ تو اس قدر ناقابلِ شکست ہے کہ ایک کا وجود دوسرے کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ آپ کو اپنے ڈاکٹر کی وہ ضرب المثل تو خوب یاد ہوگی کہ ایک صحت مند روح، صحت مند جسم میں ہی رہ سکتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جسمانی نظام کی ضعیفی یا معمولی سی معمولی خرابی کا بھی انسانی احساسات و خیالات پر ایک بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ مریضوں کے سلسلے میں ہر انسان کا تجربہ ہے کہ وہ چڑچڑے اور بدمزاج ہو جاتے ہیں اور ان کے لئے زندگی کے عام مدوجزر سے مسرت حاصل کرنے کے امکانات روبہ زوال ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بڑھاپے کے جسمانی انحطاط کا ایک نمایاں اثر انسان کے مزاج پر ہونا لازمی ہے ضعیف جسم، غم، غصہ نفرت اور ایسی ہی دوسری چیزوں کا مقابلتاً جلدی آماج گاہ بن جاتا ہے اور انسانی زندگی کے وہ سب پٹ زنگ آلود ہونے لگتے ہیں جن سے گزر کر مسرت کی خوشبودار لپٹیں انسانی دل کے دروازوں پر دستک دیا کرتی ہیں۔

ضعیف جسم کے طفیل خیالات و احساسات کا مریضانہ صورت اختیار کر جانا تو خاصی عام سی بات ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ماحول کی تبدیلی کا بھی انسانی خیالات و احساسات پر ایک زبردست اثر پڑتا ہے مثال کے طور پر آپ کرشن چندر کے گرجن کی وہ شام یاد کیجئے۔ جبکہ سطح سمندر سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر انسانی محبت میں لازوال پاکیزگی اور رفعت آگئی تھی اور اس کا مقابلہ ہزاروں فٹ نیچے ٹوٹے ہوئے تاروں کی سستی اور خالص جنسی محبت سے کیجئے اور آپ کو ماحول اور فضا کی تبدیلی کا انسانی خیالات پر اثر نمایاں طور پر نظر آجائیگا۔ ماحول کی تبدیلی تو خیر ایک طرف رہی نفسیاتی تحقیقات نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا ہے کہ رنگوں کی تبدیلی سے انسانی حسیات میں ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہونے لگتا ہے۔ مثلاً آسمانی رنگ انسان کو اداس کر دیتا ہے لیکن اس کے برعکس سُرخ اور قوس قزحی رنگوں سے انسانی خیالات میں بھی حرکت اور زندگی دوڑنے لگتی ہے اور ٹھہراؤ اور یکسانیت کا وہ تمام طلسم ٹوٹنے لگتا ہے جو مسرت کے لئے زہرِ قاتل ہے۔

لیکن جہاں ایک صحت مند روح کے لئے ایک صحت مند جسم کی ضرورت ہے۔ وہاں ہم یہ اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ کہ ایک صحت مند جسم کو برقرار رکھنے کے لئے ایک صحت مند روح بھی نہایت ضروری ہے۔ یہاں آوڈن کے وہ الفاظ یاد کیجئے کہ خیالات کی پریشانی کا نتیجہ بیماری کی صورت میں بھی انسان پر نازل ہو جایا

کرتا ہے ۔ بیماری تو خیر ایک بڑی بات ہے ، حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY)
یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ خیالات انسان کے جسم پر بُری طرح اثر انداز ہوتے ہیں ۔
مثلاً خطرے کا شعور ہونے پر دل کا یک بارگی زور سے دھڑک اُٹھنا یا ہجومِ غم
یا موج در موج مسرت کے طفیل بھوک کا کم ہو جانا یا آنسوؤں کا اُمڈ آنا ، صاف
طور پر اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ ہمارے خیالات شعوری سطح پر اُبھر آنے کے
بعد فی الفور ہمارے جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اس سلسلے میں چونکہ ہمارے عصبی
نظام پر دباؤ پڑتا ہے اور خون کی روانی متاثر ہوتی ہے لہٰذا جسم کے وہ حصّے
جو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حسّاس ہیں ، مثلاً آنکھ ، دل وغیرہ وغیرہ جلد ہی
ہمارے خیالات کی زد میں آ جاتے ہیں ۔ پس جب یہ کہا جائے کہ مسرت صحت مند
جسم کی ہمرکاب ہے اور ایک صحت مند جسم کی برقراری کے لئے ایک صحت مند
روح کی ضرورت ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مسرّت حاصل کرنے کے لئے
یہ انتہائی ضروری ہے کہ انسانی خیالات و احساسات صحت مند حدود کے مابین اپنے
مدّو جزر کو قائم رکھیں اور کسی ایک سمت زیادہ جھک کر زندگی کو غم و اندوہ کی آماجگاہ
نہ بننے دیں ۔

لیلائے مسرّت کے حصول کی اس پُر اسرار اور دلچسپ تگ و دو میں حسبِ تیسرے
ستون کا ہمیں سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اس کی اساس زندگی کے خوابوں پر کھڑی ہے
ـــــ زندگی وہی آرزوں اُمنگوں اور امیدوں کا ایک خواب انگیز تانا بانا ،

جس کی ڈھور کا ایک سرا ہمارے دل سے بندھا ہے تو دوسرے سے ہم نے ستاروں کے جھروکوں سے ناطہ جوڑ رکھا ہے۔ اور جب ان جھروکوں میں آرزوؤں اور امیدوں کی حسین اور نازک اندام پریاں کھڑی ہو کر نقرئی قہقہے لگاتی ہیں۔ تو ہمارے دل کی دھڑکنیں بھی سہ چند ہو جاتی ہیں۔ البتہ جب کبھی ان میں سے کوئی ایک جھروکا ٹوٹ جاتا ہے تو دل غریب کو خاصا زور کا جھٹکا لگتا ہے اور عمرِ رواں کی کشتی تو ایک دفعہ ناخدا سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے۔

خواب —— ہماری حیاتِ مفلس کے ایسے رفیق و غمگسار ہیں کہ ان کے بغیر کائنات کا بے رنگ و بو اور زندگی کا لطافتوں اور خوشبوؤں سے معرا ہو جانا کوئی بڑی بات نہ ہوتی۔ یہ خواب ہماری ہر آن بدلتی ہوئی زندگی پر کبھی آرزوؤں، ارمانوں اور امیدوں کا روپ دھارے، کبھی یادوں کا لطیف اور نازک آنچل اوڑھے، اور کبھی ہوائی اُمنگوں کے لباس پہنے ہلکے گہرے اور سرمئی بادلوں کی طرح ہر لحظہ چھائے رہتے ہیں۔ میں اُن صوفیوں یا ویدانتیوں کی بات نہیں کرتا۔ جنہیں تمام زندگی ایک خواب نظر آتی ہے —— میں تو ان عام انسانوں کی بات کرتا ہوں جن سے اگر ان کے خواب چھین لیے جائیں، جن سے اگر ان کی ہر لحظہ تسکین آور سوچ ہتھیا لی جائے تو اُن کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ بھی نہ نکل سکے اور وہ پھولوں کی طرح کمھلا مرجھا کر دوشِ ہوا پر پریشان ہو جائیں۔

خوابوں کے یہ لطیف اور باریک آنچل ہماری زندگی کے تمام ادوار پر چھلے

ہوئے ہیں۔ چنانچہ جہاں ہم ان کی مدد سے اپنی عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں، وہاں ان ہی کے طفیل ہم آنے والے مستقبل کو بھی رنگین اور پُراسرار بنا لیتے ہیں اور جب کبھی "حال" اپنی گھٹا ٹوپ یکسانیت اور کرختگی کو لئے ہوئے ہمارے سامنے آتا ہے تو بھی ہم پی کر کھو کر، پڑھ کر، لکھ کر، جیسے بھی بن پڑے، ان ہی کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

زندگی کی کرختگی کے مقابلے میں خوابوں کی پُراسرار اور مسرت انگیز دنیا ایک دلچسپ تضاد پیش کرتی ہے۔ اب زندگی اپنی تمام تر کرختگی اور سنگلاخی یکسانیت کے ساتھ ایک لمحے سے زیادہ پائدار نہیں ہوتی۔ یہ لمحہ جب گزر جاتا ہے تو ماضی بن جاتا ہے اور ماضی کے دھندلکوں میں اس کی کرختگی کا بیشتر حصّہ تباہ ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ زندگی کے ناسور بھی مندمل ہونے لگتے ہیں اور وہی ایک زخم جو کسی وقت جان لیوا نظر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ مندمل ہوتا ہُوا ماضی کے پُراسرار دھندلکوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کے اس لمحے کے بعد آنے والے تمام لمحات مستقبل کی امانت ہیں اور ان کی کرختگی کو اُمیدوں، آرزوؤں اور ارمانوں کے لطیف آنچلوں نے چھپا رکھا ہوتا ہے۔ البتہ جب وہ حال کے فانوس کے سامنے سے گزر کر ماضی کی سمت بڑھنے لگتے ہیں تو نظر اُن کے لطیف آنچلوں کو پار کر کے ان کی اصلی صورت پر بھی جا پڑتی ہے۔ اور دل کی امیدیں ٹوٹ کر آنکھوں میں ایک شفاف سا بلوریں محل تعمیر کرنے لگتی ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے

کیا یہ لمحہ زیادہ پائدار نہیں ہوتا۔ جلد ہی یہ ماضی بن جاتا ہے اور وہ خلش جو اس ایک لمحے کی کرختگی سے پیدا ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ ختم ہوتی ہوئی معدوم ہو جاتی ہے۔

دراصل کائنات کی تشکیل ہی کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگیوں میں حال کا یہ لمحہ بہت زیادہ وسعت کا حامل ہوتا ہے۔ یا جن کے حال کا فانوس اتنا روشن اور تیز ہوتا ہے کہ مستقبل اور ماضی کے بیشتر حصّے بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ —— ایسے لوگ مسرّت کے وجود سے کافی حد تک تہی دامن رہ جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ زندگی کی کرختگی اور یکسانیت کو زیادہ دیر تک برداشت کر سکنا ناممکن ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ شراب، آرٹ، لیڈرشپ اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی معاونت سے اس کرختگی کو بھول جانے کی ایک سعیِ جمیل کرتے ہیں اور شاید اسی کوشش میں ان کی بقا کا راز مضمر ہوتا ہے۔

اب یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ جُوں جُوں انسان عمر میں بڑا ہوتا ہے۔ تُوں تُوں اس کے مستقبل کے خواب کمزور اور ضعیف ہونے لگتے ہیں اور ماضی کے خواب اُبھر کر زیادہ نمایاں اور پُراسرار ہو جاتے ہیں۔ جوانی میں ہمارے پیشِ نظر مستقبل کا وسیع آسمان ہوتا ہے۔ جس میں ہم اپنی آرزوؤں اور اُمنگوں کی پتنگیں اور کنکوّے اڑاتے ہیں اور اسی میں ہمیں بے پناہ مسرّت ملتی ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ مستقبل کے خوابوں کی جگہ پرانی یادیں لے لیتی ہیں۔ اور انسان انہی

کو اپنا اثاثہ جان کر انہیں زور سے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیتا ہے ـــــــ لیکن
شاید میں مستقبل کے خوابوں کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا۔ کیونکہ عمرِ رواں کیساتھ
مستقبل کے خواب بھی تو پائندہ رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان خوابوں کا
مرکز وہی نہیں رہتا۔ پہلے انسان فقط اپنے متعلق سوچتا تھا اب وہ دوسروں
کے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ بقولِ کرشن چندر "پھول اپنی کلی میں، ہرن اپنے
نافے میں، عورت اپنی بیٹی میں اپنی جوانی کی بہار دیکھتی ہے اور یہ چیز اُسے
اُس مسرت سے ہم کنار کر دیتی ہے جو اپنی ذات پر مرکوز مستقبل کے خوابوں
کی پیداوار تھی۔

لیکن اگر ہم ان خوابوں کے نفسیاتی پس منظر کی طرف رجوع کریں تو ہمیں
تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آسکتا ہے اور ہم ان خوابوں کو بھی زیرِ بحث لا سکتے
ہیں جو مسرت کو تحریک نہیں دیتے بلکہ جو انجام کار خواب بین کو غم و اندوہ
سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ نفسیاتی تحلیل کے مطابق جاگتے کے خواب
DAYDREAMS شرم اور جھجک سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہاں خواب دیکھنے
والا خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ کے مصداق آپ ہی ہیرو، خود ہی حاضرین
اور آپ ہی تمام پلاٹ کا خالق ہوتا ہے۔ ان خوابوں میں دوسرے کردار بھی ظاہر
ہوتے ہیں لیکن ان کا وجود سراپا ہیرو کے وجود کا مرہونِ منت ہوتا ہے ہیرو
کو خواب میں سے نکال دیجئے اور تمام خواب ایک کچے گھروندے کی طرح دھڑام

سے بنچے آگرے گا ۔ آرٹ اور لٹریچر میں بھی ایسے نمونے بکثرت ملتے ہیں جو ان
خوابوں سے مشابہ ہیں ۔ مثلاً فلمی کامیڈی یا اسی وضع کا دوسرا لٹریچر جس میں ہیرو
آخوش کامیاب رہتا ہے ۔ ان نمونوں کی ہر دلعزیزی کی ایک بڑی وجہ بھی یہی
ہے کہ یہ ایک طرح کے جاگتے کے خواب ہی ہوتے ہیں جن میں دیکھنے والا
ہیرو کو جذباتی طور پہ خود میں مدغم کر لیتا ہے ۔ یہاں تک کہ ہیرو کے مصائب اس
کے اپنے مصائب بن جاتے ہیں اور ہیرو کی کامیابی اس کی اپنی فتح !!

جاگتے کے خواب اکثر و بیشتر خواب بین کی ان خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں
جو حقیقت میں پوری نہ ہو سکیں ۔ مثلاً کمزور جسم کے لوگ خواب ہی خواب میں بڑے
زبردست پہلوان بن کر حریف کو پچھاڑ دیتے ہیں ۔ یا باؤلنگ کرتے ہوئے ایم سی
سی کی ساری ٹیم پندرہ منٹ میں آؤٹ کر دیتے ہیں ۔ پھر وہ جاگتے کے خواب
بھی ہیں جو صرف محبوبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں ۔ محبوبہ کسی پہاڑ کی چوٹی سے گرتی
ہوئی بچائی جاتی ہے ۔ یا ڈاکوؤں کے نرغہ سے اسے چھٹکارا دلایا جاتا ہے ۔
اور وہ خوش ہو کر خواب بین کو اپنے ملائم بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہے یا پھر جنسی
خواب ہیں جو خطرناک مراحل میں داخل ہو کر جنسی خواہشات کی تکمیل کے محرک
بن جاتے ہیں اور انسان زندگی کے ان ادوار میں داخل ہو جاتا ہے جو اسے
نیوراتی حالت اور ایک زبردست ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں

دراصل ہماری روزمرہ کی زندگی میں ایسے بہت سے مقام آجاتے ہیں ،

جہاں ہم حقائق کی سنگلاخ چٹانوں سے کترا کر، خوابوں کی چھوٹی چھوٹی پگ ڈنڈیاں اختیار کر لیتے ہیں۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ خواب اس لئے ضروری ہیں کہ یہ اُن خواہشات کی شدت کو انحطاط پذیر کر دیتے ہیں، جو حقیقت میں پوری نہ ہو سکیں۔ اور اس لئے بھی کہ آرزوؤں کی اصل تکمیل کی طرف یہ ایک ضروری قدم کی حیثیت بھی رکھتے ہیں یہاں تک یہ خواب نہ صرف ہماری زندگی کو خوشگوار بنانے میں ہی محرک ثابت ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات زیست کی کرختگی، ٹھہراؤ اور یکسانیت کو معدوم کرتے ہوئے ہمیں مسرت کے آستانے پر بھی پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن جب یہ خواب عام صحت مند حدود سے تجاوز کر کے ان مراحل میں داخل ہو جائیں جہاں خواب بین حقیقی دنیا سے ذہنی طور پر قطعاً الگ تھلگ ہو جانے میں ہی اپنی عافیت دیکھے اور دنیا کے ساتھ قدم ملانے کی بجائے اپنے ہی خوابوں میں منجمد ہو کر رہ جائے۔ تو یہ ایک ایسی خطرناک چیز بن جاتے ہیں جو بالآخر خواب بین کو مسرت کی بجائے غم و اندوہ سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اور زیست کی اٹکھیلیاں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اوپر میں خوابوں کی دو اقسام کا تذکرہ کر آیا ہوں۔ ایک زمرے میں وہ خواب شامل ہیں جو ماضی سے متعلق ہوتے ہیں اور دوسری قسم اُن خوابوں پر مشتمل ہے جن کی اساس مستقبل پر قائم ہوتی ہے۔ ماضی کے وہ خواب جو کسی خاص خوشگوار لمحے کی یاد کو تر و تازہ کر دیں ہمارے لئے بے حد مسرت افزا ہوتے ہیں اسی طرح ہماری مستقبل

سے وابستہ اُمیدوں اور آرزوؤں کے رنگ محل جب خوابوں کا لبادہ وڑھ کر ظاہر
ہوتے ہیں تو دل فرطِ مسّرت سے دھڑک اُٹھتا ہے۔ مگر دراصل مسّرت مستقبل
یا ماضی کے خوابوں میں نہیں بلکہ اُس رفیق یا عزیز ترین ہستی کے ساتھ بیٹھ کر ان لمحات
کی یاد میں ہے جو ہم نے کبھی اکٹھے بسر کئے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب عاشق
و محبوب مل بیٹھتے ہیں تو گزرے ہوئے لمحات کا تذکرہ قندِ مکرّر کا سا مزہ دیتا ہے
اسی طرح دو پرانے دوست جب جدائی کے ایک لمبے عرصے کے بعد زندگی
کے کسی موڑ پر اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ماضی کی اُن یادوں میں کھو جاتے ہیں جو دونوں
کا سرمایۂ حیات ہیں۔ اسی طرح مستقبل کے خوابوں کا مزہ بھی اکثر و بیشتر مل کر خواب
دیکھنے میں ہوتا ہے۔ یہ خواب بھی کسی عزیز دوست یا ہستی کی معیت میں دیکھے جاتے
ہیں اور ان کے دیکھنے سے وہ احساس بیدار ہوتا ہے جو وقت اور جگہ کی قید سے
ماورا، ہر لحظہ پائدار رہتا ہے —— اور یہاں ہم کمال آہستگی سے اُس مرغزار میں
داخل ہو جاتے ہیں جسے "محبت" کے ہمہ گیر لفظ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر
محبت کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے
کہ جب تک یہ قائم رہتا ہے۔ انسان پر چھا جانے والے آلام و افکار تاریک ترین
گوشوں میں دبک جاتے ہیں اور انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس روحانی
سرور (BLISS) میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے جو مسّرت کا عطر ہے۔ عورت اور
مرد کی اس کامیاب اور مسرت آفرین محبت کو کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔

یہ ایک علیحدہ سوال ہے اور ایک علیحدہ بحث کا طالب!۔۔۔ ہاں اتنا صاف ظاہر ہے کہ یہی محبت جب عورت اور مرد کے تعلقات سے بلند ہو کر وطنیت اور بعد ازاں آفاقیت کا لباس اوڑھ لیتی ہے تو بھی، جب تک یہ قائم رہتی ہے دل کو لازوال مسرت سے مالا مال ضرور رکھتی ہے اور یہاں پہنچ کر بے اختیار ہمیں اُس نظریے کی سچائی پر شک گزرنے لگتا ہے جس کی رُو سے تمام تر مسرت کو صرف دولت کا رہین منت قرار دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فی زمانہ لوازمِ زندگی حاصل کرنے کے لئے دولت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ محض روپے کی فراوانی سے انسان مسرت کی لہروں سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات ہوتی تو دنیا کے امیر ترین اشخاص زہر وف (ZAHAROFF) ہنری فورڈ اور نظامِ دکن دنیا کے سب سے زیادہ خوش باش لوگ ہوتے اور اگر یہ نہیں تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ مسرت محض دولت ہی کی رفیق و غمگسار نہیں بلکہ اُسے بعض ایسی چیزوں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے جو دل کے ساغر کو مسرت و نشاط سے بھر دیتی ہیں اور جو ایک مُسکراتے ہوئے پھول سے لے کر محبوبہ کی ادائے دلنواز تک چلی گئی ہیں۔

خاتمے سے پہلے میں مسرت کے متعلق مشہور فلسفی جج پی۔ ایم ہبرٹ (PM-HUBBART) کے چند قیمتی خیالات قلمبند کر دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ فاضل جج کے خیال کے مطابق اس کلبلاتے ہوئے دور میں جب کہ آلام وافکار

کی پیچیدگیوں نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ مسرت حاصل کرنے کے لئے
زیادہ سے زیادہ تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ چار ایسے گروہ موجود ہیں جو اسے مہیا کرنے
کا بیڑا اُٹھانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔
ان میں سے ایک گروہ سائنسدانوں کا ہے لیکن یہ لوگ اپنے مشن میں بری طرح
ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ سالہا سال کی محنت کے بعد پنسلین جیسی حیرت انگیز دوا
ایجاد کر لیتے ہیں تو اسی دوران میں ان کا کوئی بھائی بند ایٹم بم ایجاد کر کے انسان
کے آلام و مصائب میں ایک زبردست اضافہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح ماہرین اقتصادیات
کا گروہ ہے۔ لیکن یہ حیران کن حقیقت ہے کہ جتنا یہ گروہ انسان کو مسرت مہیا کرنے
کی کوشش کرتا ہے۔ اتنا ہی انسان بتدریج اقتصادی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں
گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی حال اُس تیسرے گروہ کا ہے۔ جس پر سیاستدانوں
کا تسلط ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں۔ لیگ آف
نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) کے اوّلین اجلاس سے لے کر یو۔ این۔ او
U.N.O کی آخری رسہ کشی تک چلے آیئے اور آپ اندازہ لگا سکیں گے۔ کہ یہ
گروہ انسان کو مسرت دلانے کا وعدہ تو کرتا ہے لیکن اسے کہاں تک پورا کر سکا
ہے۔ آخری گروہ اُن رجعت پسند اور کوتاہ بین مذہب پرستوں کا ہے جو اگرچہ
مذہب کو عالمگیر محبت اور مسرت کا محرک تصوّر کرتے ہیں لیکن جو خود اتنے متعصب ہیں

کہ دوسروں کو وہ حقوق دینے پر رضامند ہی نہیں جنہیں وہ اپنے لئے جائز اور ضروری خیال کرتے ہیں[1] ——— جج ہبرٹ کے یہ خیالات ایک گہرے تفکر اور پختہ شعور کا نچوڑ ہیں۔ اور اجتماعی زندگی میں مسرت کے سوال کا ایک زیرک اور صحت مند جائزہ !!

[1] CONVOCATION ADDRESS

مسرّت — عام زندگی میں

"ایک بات ہے بھابی" ؟

"کیا" ؟ بھابی نے دھاگا دانتوں سے کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"پنسل بناتے ہوئے ذرا زخم لگ گیا ہے ——" اس نے اُنگلی آگے کر دی

خون بوند بوند زمین پر ٹپکنے لگا۔

"اوہ —— ! یہ تو گہرا لگا ہے" - بھابی گھبرائی۔

لیکن وہ اطمینان سے ویسے ہی کھڑا رہا۔

بھابی پٹی ڈھونڈھ رہی تھی اور اُسے کتنا مزا آ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ عمر بھر اُس کا خون یوں ہی بہتا رہے۔ اور بھابی آہ کاش ! اسی طرح گھبرائی ہوئی

پتی ڈھونڈتی رہے ''

("شکست" از شمس آغا)

اسی کیفیت کو جسے ایک وقت انسان ابدیت سے ہم کنار دیکھنا چاہتا ہے، فانٹی نیلی نے مسرت کا نام دیا ہے لیکن حقیقت میں یہ کیفیت نہ تو ابدیت کی حامل ہوتی ہے اور نہ اس کا سحر، ابدیت کی فضا میں قائم ہی رہ سکتا ہے ـــــــ محبوب بچھڑ جاتا ہے، پھول مرجھا جاتے ہیں، شفق گم ہو جاتی ہے، نغمہ تھم جاتا ہے۔ اور موت کا عفریت ایک شاداں و فرحاں زندگی کو نگل جاتا ہے ـــــ اور یوں وہ ایک لمحہ جو سمٹ کر انسان کا قیمتی اثاثہ بنا تھا۔ منتشر ہوتا ہوا ناپید ہونے لگتا ہے، ویسے بھی اگر اس لمحے کی مسرت آفریں کیفیت ذرا وقت کے سنبھالے سے بے نیاز ہو کر ٹھہرنا پسند کرے تو اس کی شدت میں ایک فوری تغیر نمودار ہونے لگتا ہے تا آنکہ اس کی سحر کاری معدوم ہوتی ہوئی فنا ہو جاتی ہے اور انسان چونک کر بیدار ہو جاتا ہے ـــــــ فی الواقعہ کسی مسرت بھرے لمحے کی خوبی اس کی طوالت میں نہیں بلکہ اس کے اختصار میں ہے۔

یہاں تھوڑی دیر کے لئے مسرت کی منفی اور مثبت کیفیات کا تجزیہ کر لینا لازمی ہے۔ تاکہ مسرت کی ماہیت اور اس کے زندگی پر اطلاق کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ چنانچہ مشہور چینی مصنف لن یوٹانگ کے مطابق مسرت

اکثر و بیشتر منفی اجزا سے مرکب ہوتی ہے۔ یعنی ہماری روزمرّہ کی زندگی میں غم یا مصیبت کے فقدان کا قیمتی لمحہ مسرت آفریں کیفیات کا حامل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری زندگیاں افکار و حادثات کے بوجھ تلے اس قدر سہمی سمٹی رہتی ہیں کہ جب کبھی کوئی سہارا مل جاتا ہے یا یہ بوجھ چند گریزاں لمحات کے لئے شانوں سے نیچے آرہتا ہے تو محسوس ہوتا ہے گویا ہمیں مسرت کا خزینہ مل گیا ہے۔ اس کی ایک مثال اس مشہور مصنف کا قصہ ہے کہ جس نے غروبِ آفتاب کے وقت کسی سرسبز ٹیلے پر سے ایک ریل گاڑی کو اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا اور اسے محسوس ہوا گویا ہزاروں افکار و آلام ریل کے ڈبوں میں بند اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے روپوش ہو گئے ہیں ——

یہ منفی مسرّت زندگی کے اس ڈرامے کے ہر ڈراپ سین پر ہمارے پیشِ نظر ہوتی ہے اور ہم اس کے چند گھونٹ پی کر اپنی تشنہ و درماندہ روحوں کو تازہ دم کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک مثبت مسرّت بھی ہے، کہ جسے حاصل کرنا یا جس میں ڈوب کر رہ جانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ یہ مسرّت صرف ان لوگوں کو ارزانی ہوتی ہے۔ جو نہ صرف ایسے موقعوں کے جویاں ہی رہتے ہیں جن کے طفیل وہ اسے محسوس کر سکیں بلکہ جو خود اپنی سعی سے ایسے موقعوں کو معرضِ وجود میں آنے کی تحریک بھی دیتے ہیں۔ یہاں ہیزلٹ HAZLITT کے مشہور مضمون (GOING ON A JOURNEY)

کے وہ الفاظ یاد کیجئے ــــ "آسمان نیلا اور شفاف ہو۔ زمین پر حدِّ نظر تک سبزہ بچھا ہوا ہو۔ ایک لچکتی، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی اُفق تک دوڑتی چلی گئی ہو اور مجھے تین گھنٹے کی سیر کے اختتام پر لذیذ کھانے کے ملنے کی توقع ہو۔ ممکن نہیں کہ میں خوشی سے تھرکنا نہ شروع کر دوں۔ ایسے لمحوں میں میں ناچتا ہوں، کودتا ہوں اور خوشی سے گانا شروع کر دیتا ہوں"۔ مثبت مسرّت کے ان لمحات کو ایک اور مصنّف نے یوں تحریر کیا ہے" جب موسمِ گرما کی ایک اُداس شام کو میں افق پر گھرے سیاہ بادل گھرتے ہوئے دیکھتا ہوں اور مجھے یقین ہوتا ہے کہ برسات کا گرجتا گنگناتا بادل چند ہی لمحوں میں محیط ہو کر برسنے لگے گا تو میں گھر سے نکل کر دور کھیتوں میں چلا جاتا ہوں۔ اور پھر بارش میں بھیگا، کپڑوں کو پانی سے تر اور بہ کئے گھر لوٹتا ہوں ــــ اُس وقت مجھے سچّی مسرّت کا شدید احساس ہوتا ہے"۔

لیکن اِس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا بھی مناسب نہیں ــــ کہ مسرّت کوئی تلاش ہونے والی یا بیرونی اشیاء سے لپک کر انسان کے سراپا پر مسلّط ہو جانے والی چیز ہے۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ "انسان کے اندر ایک پُراسراری روشنی ہے جو بیرونی اشیاء کو بھی منوّر کر دیتی ہے روشنی مسرّت کا عطر ہے۔ . . . .

چنانچہ دراصل اشیاء یا واقعات ہماری مسرّت کا منبع نہیں بلکہ ہماری مسرّت

تو اُس ذہنی کیفیت سے عبارت ہے جو اشیا کو ایک نئی زندگی اور ایک انوکھا رنگ تفویض کرتی ہے۔ اگر کسی شخص کا دل خوش ہے تو اُسے فضا، ماحول، زندگی — آسمان، پہاڑ اور سمندر، ہر چیز سے مسرّت پھوٹتی ہوئی نظر آئے گی لیکن اس کے برعکس ایک رنجیدہ دل کو ہر چیز پر تاریکیاں اور ہر شئے میں بھیانک گہرائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ سوامی رام تیرتھ کے متعلق مشہور ہے کہ اُن کی قلبی واردات کچھ اس قسم کی مسرت سے ہم کنار تھیں کہ تبسّم اُن کے ہونٹوں سے اُترتا ہی نہیں تھا اور وہ جب کسی سے بولتے اُسے محسوس ہوتا کہ مسرت سوامی کے ہر مُوئے بدن سے نکل نکل کر فضا کو بہجت سے لبریز کر رہی ہے — روزمرّہ کی زندگی میں بھی آپ کو کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور ملا ہوگا جس کے ہونٹوں پہ لرزتا ہوا تبسم اُس کی دلی طمانیت کا غمّاز ہوگا۔ اس کے قہقہوں میں جان ہوگی۔ اور اس کی حرکات و سکنات سے بھرپور زندگی مترشح ہو اور اُسے مل کر اور اُس سے باتیں کر کے یوں محسوس ہوا ہوگا۔ گویا کوئی برقی رَو آپ کے سراپا میں سرایت کر گئی ہے — یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک مسرّت کی اہمیت اُس کے حصول میں نہیں بلکہ اُس کی تقسیم میں ہے۔ ایسے لوگوں کے مطابق دیکھنے کی بات یہ نہیں کہ آپ نے زندگی میں خود کتنی مسرّت حاصل کی بلکہ یہ ہے کہ آپ نے کس قدر مسرّت اوروں کو مرحمت فرمائی۔ چنانچہ وہ برملا کہتے ہیں کہ ایک خوبصورت نظم ایک خوبصورت مکان کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم ہے — اس لئے کہ خوبصورت مکان تو صرف

اپنے مکین یا چند افراد کو مسرت بخشتا ہے لیکن ایک خوبصورت نظم کروڑوں نغموں پر بھاری رکھ کر اجتماعی مسرت میں بے مثال اضافے کا موجب ثابت ہوتی ہے لیکن میں پھر کہوں گا کہ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ مسرت، چندرما کی طرح تاریک وادیوں اور گہری گھاٹیوں کو اپنی نورانی کرنوں سے سحر انگیز تابندگی تو عطا کرتی ہے لیکن خود ماحول سے متاثر نہیں ہوتی۔ چاند وادیوں پر بھی اسی طرح چمکتا ہے جس طرح کہ صحراؤں پر لیکن یہ وادیوں کا حسن بھی تو ہے جو چاند کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ چنانچہ نظرِ عمیق اس بات کی گواہی دے گی کہ ماحول مسرت کی مختلف کیفیات پر نئے نئے ڈھنگوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال شہری اور دیہاتی زندگیوں کا موازنہ ہے۔ شہری زندگی کی امتیازی خصوصیت ہنگامہ اور کش مکش ہے نتیجتہً مسرت کی نوعیت بھی ہنگامی اور گریز پا ہوتی ہے یہاں مسرت زیادہ تر منفی کیفیات کا مرکب ہوتی ہے دفتر کے دن بھر کے جھمیلوں اور فریب، ریاکاری اور بجھی بجھی زندگی کے طویل وقفوں کے بعد بچوں کے معصوم قہقہے یا سینما کی متحرک تصاویر، کسی علمی و ادبی مجلس میں شرکت یا محض چند ایسے دوستوں کی صحبت کہ جن کے خیالات و احساسات ایک جیسے ہوں ——

اس کے برعکس دیہات میں سکون اور خاموشی کا دور دورہ ہوتا ہے یہاں کائنات اپنی تمام تر رنگینیوں میں ملبوس اور فطرت اپنی تمام تر سحر کاریوں کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہے۔ یہاں سمندر کی وسعت، کوہساروں کی بلندی، شفق کی رنگینی اور طوفانوں

کا خروش ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب سی طلسمی خاموشی جس کا سحر انگیز تانا بانا انسانی احساسات کو اسیر کر لیتا ہے۔ یہاں اس ماحول میں، انسانی مسرت کی نوعیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ مسرت کی مثبت کیفیات ابھرنا شروع ہو جاتی ہیں اور انسان (بشرطیکہ وہ خوشی حاصل کرنے کے قابل ہو) قدم قدم پر کسی شفق کے روبرو، کسی پہاڑ کے سامنے، کسی وادی میں پہنچکر یا محض ایک اُڑتے ہوئے بادل کے ریشمیں آنچل کو دیکھ کر، ایسی مسرت محسوس کرتا ہے جس کا بیان کرنا بھی مشکل ہے۔

چنانچہ مسرت پر ماحول کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن جب ہم مسرت کو اس کی منفی اور مثبت کیفیات سے ماورا ایک مجموعی حیثیت سے جانچتے ہیں تو ہمیں بے اختیار لن یوٹانگ کے اس نظریئے کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ جس کے مطابق مسرت کا راز کسی خاص ماحول کی نہیں، بلکہ ہر ماحول کی روزمرّہ کی زندگی سے لطف اندوز ہونے میں ہے، عام اس سے کہ یہ زندگی شہری ہے یا دیہاتی ہنگامی ہے یا سکون ریز، امارت کی بلندی پر ہے، یا غربت کی گہرائی میں، دوستوں کے قہقہوں میں ہے یا تنہائی کی مسکراہٹ میں ——— !

اور یہاں اس سنجیدہ بحث کے درمیان اگر زندگی کے چند بظاہر غیر اہم کرداروں کا تذکرہ بھی قابلِ قبول ہو تو میں اپنے گاؤں کے دو ایسے اشخاص کا ذکر ضرور کرونگا، جنہیں حیات سے شدید وابستگی نے دو انوکھے نظریوں کا خالق بنا دیا ہے

ان میں سے ایک کا نام چرٹت رام ہے اور یہ اچھوت ہے اور دوسرے کا نام دلاور خاں ہے۔ اور یہ مسلمان ہے ـــــ چرٹت رام جب وقت ہمارے گاؤں میں آیا تو اس کی عمر پندرہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ یکہ و تنہا تھا اور آج بھی وہ اکیلا ہے۔ اس وقت بھی اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور آج بھی وہ تہی دامن ہے لیکن اس کی زندگی ایک انوکھی مسرت سے ہم کنار ضرور ہے چرٹت رام پچھلے چالیس برس سے گدھے کی بلا ناغہ سواری کر رہا ہے اور یہی سواری اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ گدھے کے گلے میں گھونگھرو ڈالے جب وہ اس پر سوار ہو کر سیر کو نکلتا ہے تو فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور اس کے منہ سے مارے خوشی کے چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔ ویسے بھی اس کی زندگی پر "بچپن" مسلط ہو چکا ہے اور وہ اپنی مختصر اور محدود دنیا میں بچوں کی سی مسرت حاصل کرتا ہے ـــــ ایک نیا گدھا، چند گھونگھرو ریل گاڑی کا سفر اور چڑیا گھر کی سیر ـــــ یہی اس کے خواب ہیں اور ان خوابوں کی تکمیل ہی اس کی زندگی کا سب سے نمایاں مقصد۔

اس کے برعکس دلاور خاں ایک جہاندیدہ شخص ہے ـــــ اتنا جہاندیدہ کہ وہ کوشش کرتا ہے کہ دوسرے اسے احمق ہی خیال کریں۔ دلاور کی مسرت

---

(1) BLESSED ARE THE IDIOTS: FOR THEY ARE THE HAPPIEST PEOPLE ON EARTH—LOATSE

کا راز اُس کے فلسفۂ حیات میں ہے ـــــ وہ فلسفۂ حیات جو میری رائے میں لن یوٹانگ کے فلسفۂ حیات سے بہت قریبی مماثلت رکھتا ہے اور اس کے باوجود اپنی شدید انفرادیت کی بنا پر اُس سے انوکھا بھی ہے۔ دلاور کوّے سے لے کر مرغ تک ہر چیز کو نہایت رغبت سے کھا جاتا ہے کیوں کہ اُس کا قول ہے کہ پَر سیاہ ہوں یا سفید، ان کے نیچے گوشت کی رنگت ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ یہ شخص ہر چیز سے ایک پُراسرار سمجھوتا کرنے کا عادی ہے۔ وہ برملا کہہ اُٹھتا ہے "میں مانتا ہوں کہ الف سچّا ہے لیکن ب بھی بالکل جھوٹا نہیں ہے" ـــــ انسان کی پیدائش پر وہ خوش ہوتا ہے لیکن انسان کی موت پر وہ قہقہے لگانے شروع کر دیتا ہے، اگر اُس کے پاس سینکڑوں روپے ہوں تو بھی اور اگر اس کی جیب یکسر خالی ہو تو بھی اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یکساں طور پر جاذبِ نگاہ رہتی ہے ـــــ یہی قناعت اس کے کردار کا مابہ الامتیاز ہے۔ اور اسی کے طفیل اس کی مسرت پائدار عناصر کی حامل!

زندگی کے متعلق ان دونوں نظریّوں کو یک جا کر دیجیے یعنی ایک کی معصومیت کو دوسرے کی بے نیازی کے ساتھ ملا دیجیے، اور آپ کو لن یوٹانگ کے اُس نظریۂ حیات کا خاکہ نظر آنے لگے گا جس کے مطابق مسرت کا راز زندگی کو سنجیدہ اہمیت دینے میں نہیں بلکہ محض روزمرہ کی زندگی سے لطف اندوز ہونے میں ہے۔

اب اگر غور کریں تو روزمرّہ کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ انسان اِس زندگی کو حقیقی REAL تصور کرے مسلمانوں کے دنیاوی طور پر بہت زیادہ ترقی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے کبھی اِس زندگی کو پوری اہمیّت نہ دی بلکہ عقبےٰ کے تصوّر کو اہم سمجھتے رہے اور حیاتِ بعد موت کو حقیقی اور سچی کیفیات کا حامل خیال کرتے رہے ۔ یہی حال بدھ مذہب کے پیروؤں کا ہوا۔ لیکن انہوں نے تو اس زندگی کے تمام تر لوازم سے قطعی طور پر منہ ہی موڑ لیا۔ چنانچہ ان کا مذہب ایک "نمایاں نفی THE GREAT NEGATION کا مظہر ہو گیا اور وہ زندگی کے ہنگاموں کو تیاگ کر، تاریک گپھاؤں، راہب خانوں اور پہاڑوں اور جنگلوں کی تنہائیوں میں دبک کر رہ گئے ۔ اور نروان پر اپنی تمام تر توجہ کو مرکوز کر لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے اس نظریۂ حیات کی بدولت نیچر کے زیادہ قریب آ گئے ۔ اور انہیں قدرتی مناظر اور کائنات کی اندھی قوتوں سے براہِ راست متکلم ہونے اور یوں ایک انوکھی مسرت حاصل کرنے کے بڑے بڑے موقعے بھی مل گئے لیکن آخرش یہ ایک طرح کا فرار ہی تو تھا۔ وہ دراصل "زندگی" سے بھاگ گئے تھے اور غم و آلام کو زبردستی بھلا کر "سکون" حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے (اگرچہ یہ امر بحث طلب ہے کہ یہ سکون دائمی کیفیات کا حامل تھا بھی یا نہیں)، ان کے مقابلے میں دیکھئے تو کنفیوشنزم CONFUCIUSISM

تھا جس کے مطابق زندگی کا مقصد زندگی ہی سے لطف اندوز ہونے میں تھا اور جو فرار کی بہ نسبت زندگی ہی سے ہم کنار ہونے کو زیادہ اہمیت تفویض کر رہا تھا ——— یہاں بھی نیچر کا وجود تھا بلکہ بہت بڑا وجود تھا۔ لیکن اس سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی سے فرار کو تحریک نہیں دی گئی تھی۔ اس نظریے کے مطابق زندگی، خاموشی اور ہنگامے، شہر اور دیہات، آنسوؤں اور قہقہوں کا ایک دل کش امتزاج تھی اور اس کے مدّ و جزر سے مسرت حاصل کرنا انسان کا سب سے بڑا کام ———

چنانچہ لن یوٹانگ نے اپنے نظریۂ حیات کو اسی فلسفے پر استوار کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسّرت حاصل کرنے کے لئے روزمرہ کی زندگی سے لطف اندوز ہونا ضروری ہے ——— زندگی جو امیر اور غریب، چور اور پادری بیاہ اور موت، پیدائش اور بیماری اور طوفان، زلزلہ، بارش اور شفق ——— ان سب کے خوشگوار امتزاج سے عبارت ہے۔ اسی زندگی میں مسرت کا خزینہ پنہاں ہے۔ صرف غائر نظر کی ضرورت ہے اور ہم بڑی آسانی سے اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں اور اس کے خوشگوار مدّ و جزر سے مسّرت کی دولت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور چونکہ اس زندگی کا سب سے بڑا مظاہرہ ایک اوسط درجے کے "گھر" میں ہوتا ہے۔ اس لئے بقول لن یوٹانگ گھر ہی مسّرت کا مرکز ہے اور گھر کی پرسکون فضا ہی مسرت کی سب سے بڑی معاون!

اب اگر ہم اس نکتے پر ذرا بھی غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا اور روزمرہ کا معمول بھی اس بات کی گواہی دے گا کہ گھر کی چار دیواری سے باہر تو انسان پر سنجیدگی اور ڈسپلن کے موٹے موٹے پردے مسلط رہتے ہیں لیکن جونہی وہ گھر (ایک اوسط درجے کے پُرسکون گھر) میں داخل ہوتا ہے۔ تو یہ تمام باتیں یکسر دُھل جاتی ہیں اور وہ محبت، ہمدردی، سکون اور آرام کی فضا کو خود سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ یہاں نہ تو اُسے دقیق سیاسی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنا ہوتا ہے اور نہ یہاں کسی منجمد معاشرت کے مخصوص آداب اور کسی دفتری فضا کے قواعد و ضوابط ہی اس کے لئے کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں وہ آرام دہ کپڑوں میں ملبوس قطعی آزادی اور اطمینان سے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اُس کی بیوی کی خوش آمدید کہتی ہوئی مسکراہٹ، پیار اور ہمدردی اور بچوں کے معصوم قہقہے اور اس کی آمد پر دلی خوشی کا مظاہرہ —— یہ تمام چیزیں اُسے سنگلاخ حقائق اور تھکا دینے والے افکار و آلام کی دنیا سے بلند کرکے ایک حسین اور مسرت آفریں فضا میں لا کھڑا کرتے ہیں اور وہ زندگی کا مصنوعی اور تنگ جامہ اُتار کر خلوص کا ڈھیلا ڈھالا لباس زیب تن کر لیتا ہے۔ مگر اس مسرت کا تمام تر دارومدار اس بات پر ہے کہ عورت اور مرد کی زندگیاں پائدار محبت پر اُستوار ہوں۔ ورنہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ایک تاریک سی افسردگی کا پیدا ہو کر اُن کے دلوں کو یوں راکھ کر دینا کہ کُریدنے سے بھی مسکراہٹ کی چنگاری تک نہ مل سکے

کوئی غیر اغلب بات نہیں۔ البتہ وہ لوگ جنہیں اس بات کا علم ہے، کہ زندگی کی مسرت گھر کے سکون کی رہینِ منت ہے اور یہ کہ گھر کا سکون ایک دوسرے کے مزاج کے مدّو جزر کا قریب سے جائزہ لینے اور وقت کے مطابق درست روّیہ اختیار کرنے میں ہے —— ایسے لوگ اچھا ماحول پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ویسے ازدواجی زندگی کی استواری کے لئے مرد کی متحمل مزاجی خاص طور پر نہایت ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ عورت کے کردار اور مزاج میں طبعاً مدّو جزر کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں اور وہ مرد کی بہ نسبت بہت جلد جذبات کا سہارا لے لیتی ہے۔ ایک مصنف نے عورت کے مزاج کو سمندر سے تشبیہہ دی ہے —— ایک ایسا سمندر کہ جس میں کبھی طوفان آتا ہے اور کبھی سکون چھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ مرد کی دانشمندی اسی بات میں ہے کہ وہ خود کو ایک ملاح کے طریق پر چلنا سکھائے تاکہ جب طوفان اُٹھے تو وہ اپنی کشتی کے بادبان گرا دے، خاموش ہو جائے، انتظار کرے حتیٰ کہ طوفان گزر جائے اور موافق ہوا اُس کی کشتی کو صحیح سمت میں کھینا شروع کر دے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مرد خود کو صرف عورت کی سوسائٹی اور گھر کی فضا میں ہی خوش رکھ سکتا ہے ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں تلواروں کی جھنکار توپوں کی گرج، پہاڑوں کی بلندی اور مقابلے کی فضا میں مسرت کا شدید

احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ لوگ بھی زندگی کے سب لمحات ایک ہی فضا میں بسر نہیں کرسکتے۔ بلاشبہ وہ کسی شام اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ اپنا لباس تبدیل کرتے ہیں اور خود کو اپنی بیوی کے ساحرانہ حسن کے حوالے کردیتے ہیں ——

اب عورت کا راج ہے عورت کی دنیا! یہاں پیار ہے، جذبات ہیں، ہمدردی ہے اور مسرّت!!

مسرّت اور محبّت

انسان کے جسمانی اور روحانی ارتقا کے مدارج کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ حیوان کے برعکس انسان کو نہ صرف ایک نسبتاً لمبے اور غیر محفوظ بچپن سے گزرنا پڑتا ہے، بلکہ اُسے اپنی جسمانی اور ذہنی ترقی کے مابین توازن کی کمی سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ وہ یوں کہ حیوان کے برعکس انسان ذہنی طور پر تو جلد ہی اپنے ماحول کا ادراک کر لیتا ہے لیکن جسمانی تکمیل کی طرف آہستہ روی کے باعث اپنے ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے کی دیر تک تاب نہیں لا سکتا چنانچہ ایک نمایاں احساسِ کمتری جنم لیتا ہے۔ اور یہ احساسِ کمتری بتدریج اس کے احساسِ تنہائی کا محرک بنتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ جب زندگی

کے آغاز میں انسان کو ایسی ہی صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑا اور ایک احساسِ کم مائگی و تنہائی اس پر مسلط ہو گیا تو وہ از خود اُن قوانین اور حربوں کی طرف راغب ہوتا چلا گیا جن کے طفیل وہ اپنی غیر محفوظ صورتِ حال سے پیدا شدہ کمتری اور تنہائی کے احساسات کا مقابلہ کر سکتا — چنانچہ یہ ضرورت اس کے طبعی رجحانات کا جامہ اوڑھ کر قبیلہ پسندی، قوتِ اظہار اور محبت کے احساسات کی صورت میں نمودار ہوئی اور ان کی مدد سے انسان تہذیب و تمدن کی ایک طویل شاہراہ پر گامزن ہوا۔

مگر احساسِ تنہائی کا جو مرض ہزارہا سال قبل محض حیاتیاتی اثرات کے تحت نمودار ہوا تھا، آج انسانی مسرت کا سب سے بڑا دشمن بن چکا ہے اور اگرچہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان کے پاس مجلس آرٹ، مذہب اور مصروفیت کے سینکڑوں دوسرے حربے موجود ہیں۔ لیکن شاید محبت ہی وہ واحد کیفیت ہے جس کی مدد سے اُس نے اس مرض پر زیادہ سے زیادہ فتح حاصل کی ہے۔

اور اس فتح کا انداز بھی نرالا ہے۔

نفسیاتی طور پر یہ احساسِ تنہائی جو حیاتِ انسانی کے اوّلیں ادوار کی یادگار ہے، اب انسانی ذہن کا جزوِ لاینفک بن چکا ہے۔ چنانچہ آج انسان انبوہ میں رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے موجودہ زندگی کی مصروفیات

سیر و تفریح، رقص و موسیقی، سیاست اور لیڈر شپ اور ان گنت دوسرے مسائل کے باوجود اُسے اپنی زندگی کے کھوکھلے پن کا شدید احساس ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک لمحاتی کیف کے سوا اُسے اور کچھ مہیّا نہیں کرتیں، اور اُن سنگلاخ دروازوں اور سنگین دیواروں والے زندان کے تو قریب بھی نہیں جاتیں۔ جس کے اندر اُس کی روح ایک خانماں برباد شہزادے کی طرح قید ہے —— یہ قفس اُس کے الیغو (محدود خودی) کا قفس ہے اور اس کی تعمیر میں اس کے ہزار ہا برس کے دشمنِ احساسِ تنہائی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ بظاہر تو وہ سوسائٹی کا فرد ہے، کلبوں، ہوٹلوں اور سیرگاہوں میں گھومتا ہے، آرٹ اور موسیقی، سیاست اور جنگ میں حصّہ لیتا ہے لیکن بنیادی طور پر الیغو کی چار دیواری میں اس بُری طرح قید ہے کہ ہزار کوشش پر بھی اپنی روح کو کسی دوسری روح سے ہم آہنگ نہیں کر سکتا۔ ہزار کوشش پر بھی اپنے قفس کے اُن زنگ آلود دروازوں کو کھول نہیں سکتا۔ جن سے گزر کر مسرت کی لپٹیں اس کے نہاں خانۂ دل کو معطّر کر سکیں۔ ہاں —— ایک چیز اُسے اس قید سے رہائی دلاتی ہے اور اس کے الیغو کی منجمد دیواروں کو گرا کر اُسے کسی دوسری روح سے اس طور ہم آہنگ کر دیتی ہے کہ غیریت کے سارے مظاہر پاش پاش ہو جاتے ہیں —— یہ ہے انسانی محبّت وہ لطیف کیفیت جس کے سحر میں اسیر ہو کر دو دل ایک ہی تال پر دھڑکنے

ہیں —— وہ کیفیت جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراٗ ہے اور جس کے طفیل ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے دل میں جگہ دے کر اور اُس کے سامنے اپنے دل کی ساری کیفیات کو بے نقاب کر کے، صدیوں پرانے احساسِ تنہائی سے چھٹکارا پاتا اور یوں اپنی حیات کی محدود تنہائی کو شادیانے بجاتی ہوئی زندگی سے ہم آہنگ کر دیتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ کسی محبوب ہستی کا قرب اشیا میں نئے معنے پیدا کر دیتا ہے، کوہساروں اور وادیوں کی دلنوازی بڑھ جاتی ہے، رقص اور موسیقی کی لہروں میں ایک نیا تموج پیدا ہو جاتا ہے اور آسمان کی نیلگوں چادر کے نیچے ہر شے ایک لطیف کیفیت میں لپٹی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔

لیکن محبوب ہستی کا یہ قرب جو اگرچہ بے پایاں مسرّت کا موجب ہے کچھ عرصہ گزر جانے پر اور ماحول کی یک رنگی کے طفیل اپنی شدت کھونے لگتا ہے۔ یہ چیز گھن کی طرح آہستہ آہستہ محبّت کے خوشنما پودے کے تنے کو کھوکھلا کرتی چلی جاتی ہے۔ تا آنکہ ایک صبح انسان پر یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ اُس کے دل میں اپنے محبوب ساتھی کے لئے وہ محبت ہی باقی نہیں رہی جو آغازِ کار میں تھی۔ محبت کے سفر کا یہ موڑ بڑا خطرناک ہوتا ہے اور دیکھا جائے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ دوا کی پہلی خوراک کی طرح محبت شروع میں تو کافی اثر انگیز تھی۔ مگر مسلسل استعمال سے انسان اس چیز کا

اتنا عادی ہو گیا کہ آخرش ایک روز یہ قطعاً بے اثر ہو گئی۔

لیکن اس مسئلے پر ذرا اور غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ہستی کو اپنانے کی یہ شدید خواہش جسے ہم پورا کرنا چاہتے تھے۔ بنیادی طور پر وہی احساسِ تنہائی تھا جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور اسی احساسِ تنہائی سے چھٹکارا پانے کے لیئے انسان ایسی ہستی کی طرف راغب ہوا جس کے ساتھ وہ روحانی اور جسمانی طور پر ایک ہو سکتا۔ محبت کا یہ پہلا ملاپ تو بڑا مسرّت افزا تھا۔ لیکن خواہش کی تکمیل، خواہش کی موت ثابت ہوئی اور آہستہ آہستہ محبوب ہستی اُس کشش سے محروم ہوتی چلی گئی کہ جس نے محبّت کے اوّلین شعلوں کو تحریک دی تھی۔

دراصل محبّت کی یہ اذیّت ناک موت جس سے مسرّت کے سوتے بھی خشک ہو جائیں، ہماری اپنی غلط ذہنی کروٹ کا نتیجہ ہے "حصول" سے پہلے محبّت کے ایام تو بالعموم اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ محبت میں تھکن پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو صرف ازدواجی زندگی میں شب و روز ایک جگہ رہ کر اور ایک دوسرے کے لیئے کھلی کتاب کا درجہ اختیار کر لینے کے بعد ہی ایک ایسا مقام آتا ہے کہ اکتاہٹ کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ ازدواجی زندگی کی مسرت کے لیئے جہاں یہ ضروری ہے کہ مرد اور عورت میں اتنا گہرا اختلاف پیدا نہ ہو جائے کہ دونوں ایک چھت کے نیچے سونے کی تمنا ہی چھوڑ دیں

وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں کے خیالات، میلانات اور زندگی کے متعلق نظریات میں وہ یک رنگی بھی نہ آنے پائے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ایک کھُلی کتاب کا درجہ اختیار کر جائیں۔ اور ایک کے لئے دوسرے میں کوئی نئی بات ہی باقی نہ رہے پس وہ تمام لوگ جو اس چیز کی آرزو کرتے ہیں کہ اُن کی محبوبہ ان کی اپنی نمایاں خصوصیات کا مکمل نمونہ ہو، چونکہ محض خود پرستی کا شکار ہوتے ہیں۔ لہذا زندگی کی مسرتوں سے بالعموم محروم رہ جاتے ہیں۔ دراصل عورت اور مرد کے مزاج، کردار اور نظریات میں ہلکا ہلکا اختلاف انہیں ایک دوسرے کے لئے پُرکشش بنانے میں محرک ثابت ہوتا ہے اور چونکہ اختلاف اور بُعد (چاہے وہ کسی قسم کا ہو) انسان میں احساس تنہائی کو اُبھارتا ہے۔ اور از بسکہ احساس تنہائی کا ردِعمل دوسری ہستی کو اپنانے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ لہذا عورت اور مرد میں یہ خفیف سا بُعد اُن کی محبت کی شدت کو کبھی انحطاط پذیر ہونے نہیں دیتا اور وہ مسرت کی خوشبوؤں سے سدا لطف اندوز رہتے ہیں۔

دراصل عورت اور مرد کا یہ بُعد ایک لحاظ سے ضروری بھی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر یہ بُعد نہ ہوتا تو اپنانے کی خواہش ہی کیسے پیدا ہوتی؟ چنانچہ اگر ہم اس مسئلے کو حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) حل کرنا چاہیں تو ہمیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ زندگی کے آغاز میں مرد اور عورت ایک

ہی جسم میں موجود تھے۔ پھر جدا ہوئے اور تب سے شب و روز اس خلیج کو پُر کرنے اور ایک دوسرے سے مل جانے کی تگ و دو میں بری طرح مصروف ہیں۔

مندرجہ بالا "بائی سیکشوئل تھیوری آف لائف" کے جواز میں ایک یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ آج بھی مرد کے جسم میں عورت کے جسم کے بعض نشانات موجود ہیں بعینہ جسطرح عورت کا جسم مرد کے جسم سے بعض امور میں مطابقت رکھتا ہے، نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ خیالات، احساسات اور جذبات کی دنیا میں بھی یہ ہم آہنگی موجود ہے پس اگرچہ مرد کے تمام ترجحانات کو فکر (THOUGHT) کا سہارا نصیب ہے اور عورت کے رجحانات کو احساس (FEELING) کا پھر بھی یہ امتیازی نشان اس قدر غیر واضح ہے اور ان دونوں کی حدود اس قدر الجھی ہوئی ہیں کہ مرد میں نسوانیت اور عورت میں مردانہ پن کے نمایاں رجحانات سرایت کر گئے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال تقویت اختیار کر چکا ہے کہ عورت مرد سے ایک نمایاں برتری" کی طالب ہے چنانچہ وہ پسند کرتی ہے کہ مرد میں جسمانی طاقت اور ذہنی برتری کا ایک لازوال سرمایہ موجود ہو اور وہ (یعنی عورت) اس کے ہاتھوں میں بے بس ہو جائے۔ اسی طرح یہ خیال بھی بڑا عام ہے کہ مرد عورت سے نسوانیت' کا طالب ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ عورت "سپاٹ اور ٹھوس" ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بالعموم رجحانات کا عالم یہی ہے لیکن گہری نظر

سے تصویر کا دوسرا رُخ بھی سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عورت، مرد میں کسی نہ کسی حد تک نسوانیت اور لچک کی بھی طالب ہوتی ہے اور مرد، عورت میں ایک حد تک سختی اور برداشت کا جویا۔ اس سے عورت اور مرد کی متضاد خصوصیات کو ایک دوسری کے قریب آنے کے مواقع ملتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں کہ عورت، مرد میں زیادہ زنانہ پن کو حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہے اور مرد عورت کی زیادہ "جرأت" کو اچھا نہیں سمجھتا۔ حیرت ہے کہ فرد کے لئے وہی خصوصیت جس کا وہ خود مظہر ہے، دوسری صنف میں زیادتی اختیار کرنے پر ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس بات سے انکار مشکل ہے کہ پُر مسرت ازدواجی زندگی اور محبت کے لئے مرد میں ایک حد تک نسوانیت کا ہونا ضروری ہے بعینہٖ جس طرح عورت میں مردانہ پن کے بعض عناصر کا وجود لازمی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں مرد احساسات کا سہارا لے کر گھر کے امور مثلاً بچے کی نگہداشت، عورت سے پیار وغیرہ میں نمایاں دلچسپی لیتا ہے۔ وہاں عورت اپنے پُراسرار اور مبہم احساسات سے بلند ہو کر مرد کے ٹھوس معاملات میں دلچسپی لینے لگتی ہے اور یوں ازدواجی زندگی کی بنیادیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا، خیالات اور احساسات میں ایک نمایاں فرق ہے مرد کی دنیا بنیادی طور پر خیالات کی دنیا ہے، تاریخ بھی اس بات کی شہادت

دیتی ہے کہ مرد نے فی الواقع سائنس، فلسفۂ طب اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو حیرت انگیز ترقی کی، وہ اس کے تخیل کے غیر مبہم سلسلے کی رہینِ منت تھی علاوہ ازیں یہ اُس کا تخیل ہی تھا۔ جس کے طفیل اُلجھی ہوئی زندگی نے توازن اور اعتدال کی سلجھی ہوئی صورت اختیار کی اور انسان ارتقا کی طرف تیزی سے گامزن ہو گیا۔ اس کے برعکس عورت کی دنیا بنیادی طور پر احساسات و جذبات کی دنیا تھی اور اسی لئے اس کی زندگی از سرتاپا بدلتے ہوئے رجحانات، مبہم کیفیات اور استقلال کے فقدان کی غماز رہی۔ اس سلسلے میں عورت کو چاند سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے اور یہ اس لئے کہ فی الواقع عورت کے کردار میں وہی چاند کی سی مبہم تبدیلی موجود ہے اور کردار کی اسی سیماب وار کیفیت کے باعث وہ سامنے آنے کی بجائے پس منظر میں رہی ہے۔

ویسے بنیادی طور پر عورت فطرت کی صحیح ترجمان ہے۔ یہ تسلسل کی محرک ہے اور تخلیق کرتی ہے۔ اور اسی لئے کائناتی مسائل میں اسے زیادہ وقعت حاصل ہے۔ مرد تو محض ایک کٹھ پتلی ہے جو اپنے فرض کی ادائیگی کے بعد فطرت کے لئے بے معنی ہو جاتا ہے۔ حیاتیاتی طور پر بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ مادہ کی زندگی نہ صرف نر سے طویل تھی بلکہ اتصال کے بعد بیشتر صورتوں میں نر تو فی الفور ختم ہو گیا لیکن مادہ تخلیق کو مکمل کرنے کے لئے زیادہ عرصہ زندہ رہی۔

اب چونکہ مرد کے بغیر تخلیق ممکن نہیں تھی لہذا فطرت نے عورت کو شروع

ہی میں وہ سب کچھ ودیعت کردیا، جس کے بغیر وہ مرد کو اپنے حلقۂ دام فریب میں جکڑنے سے معذور تھی۔ چنانچہ اس کی نزاکت و شعریت حسن و ادا اور اُس کے گرد شعر و نغمہ سے بنی ہوئی ایک پُر اسرار سی خواب انگیز فضا نے مرد کو اپنے طلسم ہوشربا میں اسیر کر لیا اور اس کی تمام تر جسمانی اور روحانی قوتوں کو "تخلیقِ حیات" کے مقصد کی تکمیل کے لئے آلۂ کار بنانے کی سعی کی مگر اس کا ردِّ عمل بھی ضروری تھا۔ چنانچہ مرد عورت سے فرار کی طرف مائل ہو گیا۔ یہ چیز نہ صرف اوّلین قبائل میں ملتی ہے جہاں عورت کو ممنوع (TABOO) قرار دے دیا جاتا تھا۔ بلکہ مذہب کی بیشتر روایات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ یہیں سے اخلاق کے اُس پہلو کی ابتدا ہوئی جس کے مطابق جنسی میلانات کو گناہِ عظیم تصوّر کیا گیا اور عورت کے ساتھ ملاپ کو وہ جرم سمجھا گیا جس کی بنا پر آدمؑ جیسا جلیل القدر پیغمبر فردوس کی پاکیزہ فضا سے باہر نکلنے پر مجبور ہوا۔ دراصل اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مرد شروع ہی سے جسم پر روح کی فتح کا قائل تھا اور چونکہ عورت بنیادی طور پر جسم اور اس کے لوازم اور جسم کی تخلیق کی ضامن تھی لہٰذا اُسے گناہ کا علم بردار تصوّر کیا گیا۔ جادو کے زمانے سے اب تک ڈائن کا جو تصور ہم تک پہنچا ہے۔ وہ بھی نمایاں طور پر ایک ایسی عورت کا تصوّر ہے جو جنسی خواہش کے دَور سے گزر رہی ہوتی ہے اور جس سے بھاگ جانے، فرار اختیار کرنے کی واضح طور پر

ترغیب دی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ جب ڈائن آواز دے تو ٹھہرنا اور مڑ کر دیکھنا نہیں چاہیئے۔ اور اگر تم نے پلٹ کر دیکھا تو تم پتھر کا بت بن جاؤ گے" دراصل خطرہ یوں پیدا ہوا کہ مرد نے اگر ایسی عورت کو دیکھ لیا۔ تو عورت کی جلنسی کشش مرد کے تمام ارادوں کو شل کر دے گی اور وہ اُس کے سحر میں اسیر ہو کر اپنے اعلیٰ عزائم کو تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہ جائے گا۔ عورت سے یہ فرار آج بھی ہماری سوسائٹی میں موجود ہے۔ نظم جو انسان کی لاشعوری خواہشات کی ترجمان ہے، اس حقیقت کو بدرجۂ اتم نمایاں کرتی ہے اور عورت کے "زندان" سے محفوظ رہنے اور عورت کی دنیا سے کنارہ کش ہونے کی ایک واضح خواہش اس سے جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ویسے عام ازدواجی زندگی میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ بے لوث محبت کے باوجود کچھ عرصہ کے بعد مرد، عورت کے حسین دام سے کم از کم لمحاتی طور پر فرار حاصل کرنے اور کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لینے کی ایک زبردست تحریک سے ضرور دو چار ہوتا ہے۔ دوسری طرف عورت کا مسلک یہ رہا ہے کہ وہ اپنے تسلط سے مرد کو باہر نہ جانے دے۔ عورت کا قانون بنیادی طور پر مجتمع کرنے TO BIND TOGETHER کا قانون ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ مرد اس کے بازوؤں کے مخملیں حلقے سے باہر نکل جائے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر مرد عورت کی ان مخملیں باہوں سے آزاد ہونے کی خواہش نہ کرتا تو آج اُس کے خیال کا ارتقا

اور اُس کی تہذیب کی عمارت فطرت کی اوّلیں حیوانی سطح کے نیچے ہی دبی رہتی اور یہ اس لئے کہ عورت جذبات، احساسات اور طبعی رحجانات کی ترجمان ہے اور یہ چیزیں فطرت کی حیوانی صورت سے زیادہ قریب ہیں۔

لیکن عام ازدواجی زندگی میں یہ بات بھی گہری توجہ کے لائق ہے کہ جہاں عورت ایک خاص حد تک تو مرد کو اپنے حسین دام میں جکڑ کر اُس سے فطرت کے مقاصد کی تکمیل میں مدد لیتی ہے۔ وہاں وہ اس مقصد کی تکمیل کے بعد مرد سے ایک لمحاتی گریز بھی ضرور اختیار کرتی ہے۔

چنانچہ ازدواجی زندگی کی مسرّت کی قاتل دو چیزیں ہیں — مرد کا لمحاتی فرار اور عورت کا لمحاتی گریز کہ ان کی غلط تفہیم سے کتنے ہی لوگوں کی زندگیاں بربادی اور بے بسی کی تصویریں بن گئیں۔ دراصل اگر مرد، عورت کے کردار کے متعلق پوری واقفیت رکھتے ہوئے یہ سمجھ لے کہ اس کا لمحاتی گریز ایک حیاتیاتی مسئلہ ہے کہ جس سے مفر نہیں اور عورت، مرد کے فرار کو اس کے فطری ردِّ عمل کا عکس سمجھ کر اغماض و درگزر سے کام لے تو کوئی وجہ نہیں کہ بربادی کے قعرِ عمیق میں گرتی ہوئی زندگیاں، آخری تنکے کا سہارا لے کر ہی صحیح وسلامت باہر نہ نکل آئیں اور زندگی کی مسرّتیں انحطاط پذیر ہونے کی بجائے فزوں تر نہ ہوتی چلی جائیں۔

اب جیسا کہ ہم جانتے ہیں محبت کے دو مدارج ہیں — تلاش اور

حصول اور یہ دونوں مدارج انسان کو مسّرت کے کیف زا لمحات بہم پہنچانے میں پیش پیش ہیں۔ چنانچہ محبوبہ کو حاصل کرنے کی تگ و دو اگرچہ مختصر ہوتی ہے اور بیشتر اوقات آنسوؤں اور سسکیوں کے تسلسل میں جاری رہتی ہے۔ تاہم چونکہ اسے امیدوں اور آرزوؤں کی پریاں سنوارتی ہیں اور یہ ننھے ننھے خطرات سے بھی نبرد آزما ہوتی ہے۔ اس لئے مجموعی طور پر یہ مسّرت بخش ثابت ہوتی ہے دوسری طرف محبت کا آخری مقام جسے "حصول" کہنا چاہیئے ایک سنگِ بنیاد کا درجہ رکھتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ آخر کار محبت کی اساس اسی سنگِ بنیاد پر استوار ہوتی ہے تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہوگا لیکن حیرت زا بات یہ ہے کہ مرد نے حصول سے مراد فقط "جنسی ملاپ" لیا ہے۔ اور اس بات کو قطعاً فراموش کر دیا ہے کہ جنسی ملاپ، روحانی ملاپ کے بغیر نہ صرف تسکین ہی نہیں پہنچاتا بلکہ بیشتر اوقات زندگی کو عام انسانی مسّرت سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ دراصل مرد کا یہ فطری رجحان کہ عورت کے جسم سے لذّت کا حصول اس کا "حق" ہے۔ اس کی بدقسمتی کی علامت بن جاتا ہے کیونکہ فی الواقعہ محبت میں حق یا دباؤ

یہاں میراجی کی وہ مریضانہ محبّت بھی یاد رہے جو حصول ہی سے بے نیاز ہوتی ہے ۔

یہ اور بات ہے کہ ایسی محبّت میں بھی لذّت کا عنصر ضرور ہوتا ہے :۔

"ہاں جیت میں کوئی نہیں نشّہ یہ بات ہے جیت سے دوری ہیں

جو راہ رسیلی چلتا ہوں اس راہ پہ چلتا جانے دے" ————— میراجی

کو قطعاً کوئی وقعت حاصل نہیں۔ یہاں اس بات میں کوئی فائدہ نہیں کہ آپ نے کیا کچھ چرایا اور نہ اس میں کوئی روحانی سرور ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ نے کیا تحفہ قبول کیا اور اگر واقعی آپ کو عورت سے محبت تحفتہً ملی ہے تو یقیناً آپ بڑے ہی خوش قسمت ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ مسرّت سے محروم رہتے ہیں جو اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ صنفِ مخالف سے محض لذّت کا حصول ایک غلط نظریہ ہے اور یہ کہ اس کے برعکس صنفِ مخالف کو مسرّت بہم پہنچانا ہی صحت مندی کا نشان ہے اب اگر دونوں فریق اس ناقابلِ فراموش اصول کو مدِّنظر رکھیں اور خود غرضی اور ذاتی تسکین کے رجحانات کو ثانوی حیثیت دے دیں تو یقیناً جسمانی اور روحانی سرور کے لازوال لمحے ان کے لئے متاعِ زندگی بن سکتے ہیں۔

محبت میں جسمانی اور روحانی ملاپ کا یہ پہلو اس قدر اہم ہے کہ اس سے متعلق چند مزید سطور کا اضافہ یقیناً قابلِ قبول ہوگا چین میں زمین کو مؤنّث اور آسمان کو مذکّر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ چینیوں کے مطابق عورت وہ تاریک زمین ہے جو ہر شے کو جسم عطا کرتی ہے اور مرد وہ آفتاب جو اس تخلیق میں مدد بہم پہنچاتا ہے۔ فی الواقعہ مرد اور عورت کا ملاپ، آسمان اور زمین، روح اور جسم تخیّل اور احساس کا ملاپ ہے اس ملاپ میں مرد روشنی کی طرف پشت کر کے خود کو تاریکی میں مدغم کر دیتا ہے اور عورت اس تاریکی کا سینہ چیرتے

ہوئے آسمانی رفعتوں کی طرف پرواز کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ مرد اور عورت کے اس جسمانی ملاپ میں وہ روحانی قدریں بھی سمٹ آتی ہیں۔ جو زندگی کا عطر ہیں اور جن کے بغیر زندگی فقط ٹھوس اور سپاٹ رہتی ہے۔

مناسب ہوگا اگر یہاں میں مشہور چینی خاتون میڈم کوآن کی وہ بے مثال نظم بھی درج کردوں جو اُس نے اپنے خاوند کو اس وقت لکھی تھی جب وہ کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ اور جسے پڑھ کر اُس نے نہ صرف اپنا ارادہ بدل لیا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی بیوی کا اسیر بھی ہو گیا یہ نظم عورت اور مرد کے جسمانی اور روحانی ملاپ کی بھی ایک نہایت قابلِ قدر مثال ہے۔

آج میرے اور تیرے درمیاں
بُعد کیسا، فاصلہ باقی کہاں ؟
لے ذرا مٹی کی اک چکنی ڈلی
ڈال پانی گوندھ اِس کو زور سے
اور بنا دو بُت، حسین و لاجواب
ایک بُت کی شکل ہو تیری طرح
دوسرا بُت ہو مرا ——
بُت شکن بن کر انہیں اب توڑ دے۔

ڈال پانی، گوندھ پھر ان کو ذرا
اب بنا پھر دونوں بُت
ایک اپنا
اک مرا
اب مرے بُت میں ہے کچھ تیرا وجود
اور ترے بُت میں ہے کچھ پیکر مرا
زیست کی وہ کون سی طاقت بتا
تجھ کو کر سکتی ہے مجھ سے اب جُدا؟؟

بہر حال محبّت میں جسمانی ملاپ کے سلسلے میں اس بات کو مدِّنظر رکھنا بڑا لازمی ہے کہ عورت کی دنیا جذبات و احساسات کی دنیا ہے اور جب اُسے محبّت کے دوران میں اس بات کا ذرا بھی شک ہوتا ہے کہ مرد اُسے محض ایک جسم سمجھتا ہے۔ اور جسم سے محض لذّت کے حصول کا طالب ہے تو وہ مرد کے ہاتھوں میں ایک بے جان پتُلی بن کر رہ جاتی ہے اور مرد بسا اوقات یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ وہ تو پتھر کے ایک بُت سے بغلگیر ہے —— یوں عورت کا انتقام پورا ہوتا ہے اور وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے خود سے کہتی ہے "اُسے صرف میرا جسم درکار تھا وہ اُسے مل گیا۔ اس کے سوا میں نے اُسے کچھ نہیں دیا" —— دیکھا جائے تو یہ شکست صرف مرد کی

شکست نہیں ہوتی۔ یہ مرد اور عورت کی باہمی زندگی میں مسرت کی بھی شکست ہوتی ہے۔

چنانچہ نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ عورت اور مرد کی باہمی زندگی میں "پیار حاصل کرنا" اور "پیار مہیا کرنا" خاصے اہم نکات ہیں اور ان کے مناسب حل پر محبّت کی کامیابی کا تمام و کمال انحصار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ احساس کہ کوئی ہمیں پیار کرتا ہے۔ بے اندازہ مسرت کا حامل ہے۔ اور خاص طور پر وہ لمحات تو آسمانی ہوتے ہیں جب انسان محبوب کی تمام تر شفقت اور محبت کا مرکز قرار پاتا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محبوب کو پیار کرنے میں جو لطف و مسرت ہے اس کی عام زندگی میں کوئی مثال نہیں۔ لیکن یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ لطیف ترین مسرت اُس محبت میں پنہاں ہے جو بیک وقت حاصل بھی کی جاتی ہے۔ اور نچھاور بھی ـــــ محبت جس میں اتنی از خود روانی SPONTANEITY ہوتی ہے۔ کہ طالب و مطلوب کا امتیاز یکسر اُٹھ جاتا ہے اور دو مختلف ہستیاں ـــــ روحانی اور جسمانی ملاپ کے باعث ایک ایسی تیسری اجتماعی شخصیت میں نمودار ہوتی ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی بھی تفریق باقی نہیں رہ جاتی۔

مغرب کے مشہور مفکّر برٹرنڈ رسل[۵] نے اس سلسلے میں ایک نکتہ پیش کیا ہے

۵۔ BEATRAND RUSSELL -

جو ہم سب کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے ـــــــ اس مفکّر کی نظروں میں محبت سے دو طرح کی مسّرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ فرض کیجئے آپ ایک بادبانی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ سامنے آپ کو ساحل کا ایک حسین و دلفریب منظر نظر آتا ہے اور آپ یک لخت اس منظر کی سحر انگیز تابندگی سے مسحور ہو کر ساحل کے لئے پیار کی ایک لہر محسوس کرتے ہیں۔ اس پیار میں آپ کو ایک عجیب طرح کی مسرت کا احساس ہو گا۔ اب فرض کیجئے کہ آپ کا یہ جہاز تباہ ہو گیا ہے اور عین اُس وقت جب آپ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ آپ کو ساحل نظر آجاتا ہے۔ آپ فوراً مسّرت کی ایک والہانہ لہر محسوس کریں گے لیکن یہ مسّرت، پہلی مسّرت سے قطعاً مختلف ہو گی۔ کیونکہ یہ ساحل کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں بلکہ ساحل کے طفیل موت سے محفوظ رہنے کی وجہ سے ہے۔ یہی حال انسانی محبّت کا ہے۔ اگر آپ محبوب کو اس لئے چاہتے ہیں۔ کہ اس چاہت میں آپ کو اِک نئی مسرت ملتی ہے تو یقیناً آپ کی یہ مسّرت ارفع ہے لیکن اگر آپ محبوب کو اس لئے پیار کرتے ہیں کہ اس سے آپ اپنے غم و آلام کو فراموش کر سکیں تو یہ محض ایک فرار ہے۔ اور نتیجتہً اس سے حاصل شدہ مسرت دائمی اقدار کی حامل نہیں ہو سکتی۔

آخر میں مجھے مسّرت کی اس انوکھی کیفیت کا بھی تذکرہ کرنا ہے۔ جو

ازدواجی زندگی کے اس مقام پر نمودار ہوتی ہے۔ جہاں "مرد اور عورت ایک تیسری ہستی میں اپنے جسموں اور روحوں کا حیرت انگیز ملاپ دیکھتے ہیں۔ یوں کہ نہ عورت دعوےٰ کرسکتی ہے کہ یہ تیسری ہستی یعنی بچہ تمام کا تمام اُس کی تخلیق ہے اور نہ مرد دعوےٰ کرسکتا ہے کہ فقط اُس کی ہے"[1] اب بچے کے لئے مرد اور عورت کی محبّت اس لئے اہم ہے کہ اس کی نوعیت محبّت کی عام کیفیات سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کی باہمی محبّت میں حُسن اور کشش کو دخل ہوتا ہے۔ دوست کے لئے محبّت اُس کی خصوصیات کی بنا پر ہوتی ہے۔ اگر یہ کشش جاتی رہے یا خصوصیات میں نمایاں تبدیلی آجائے۔ تو محبّت کی چنگاریوں کے سرد پڑ جانے کا بھی احتمال ہے لیکن اس سب کے برعکس جب والدین اپنے بچے سے محبّت کرتے ہیں تو یہ محبّت مستقل اَقدار کی حامل ہوتی ہے۔ ویسے "حیوانی زندگی" میں بھی بچے کے لئے شفقت بڑی نمایاں ہے اور اُس جنسی محبت سے یکسر مختلف جو مثلاً نر اور مادہ ایک دوسرے کے لئے محسوس کرتے ہیں۔ انسانی زندگی میں کنبے کی بقا اور مسرّت کا سارا راز بھی اُس محبّت اور شفقت میں ہے۔ جو والدین اور بچوں کے مابین استوار ہوتی ہے لیکن شاید بچے کی محبّت میں والدین کی بے پناہ مسرّت کا راز ایک احساسِ بقا (SENSE OF IMMORTALITY) میں مضمر ہے وہ یوں کہ شروع ہی سے

---

[1] محبت کا تدریجی ارتقاء۔ از مصنّف

انسانی غم و اندوہ کا باعث زندگی کی فانی کیفیات رہی ہیں —— وہ فانی کیفیات جن کے پیشِ نظر انسان زندگی سے شدید وابستگی پیدا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس کی زندگی غیر مرئی نہیں۔ اُسے ہر لحظہ فنا ہو جانے، کھو جانے، حرفِ غلط کی طرح مٹ جانے کا خطرہ درپیش رہتا ہے۔ ایسے میں زندگی سے کیا مسرت حاصل ہو سکتی ہے؟ لیکن اس غم سے نجات دلانے میں اُس محبّت اور شفقت نے ضرور حصّہ لیا ہے۔ جو وہ اپنے بچوں کے لئے محسوس کرتا ہے اور جس کے باعث اُسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ فانی نہیں، وہ بہتی ہوئی شادان و فرحاں زندگی کی ایک موج ہے۔ وہ اُس تسلسل کا حصّہ ہے جو ازل سے ابد تک جاری ہے جسے کبھی فنا نہیں، اور جس سے زندگی کی ساری رعنائیاں عبارت ہیں، چنانچہ ایسا انسان خود کو کائنات کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہوئے اس کی لازوال مسرتوں کا رس نچوڑ لیتا ہے اور اُسے اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ کسی روز اس کا یہ جسم فنا ہو جائے گا اور خیال بھی کیوں آئے جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ان لوگوں سے شدید طور پر وابستہ ہے جو اُس کی اپنی تخلیق ہیں اور جو زندگی کے اس تسلسل کی ڈور کو کبھی ٹوٹنے نہیں دینگے ؛

"مسرت اور آرٹ"

ایک مشہور دانشا پرداز نے زندگی سے متعلق تین اہم انسانی نظریات پیش کیے ہیں۔ پہلا نظریہ ان لوگوں کا ہے جن کے مطابق زندگی اس دنیا میں وارد ہونے، کھانے پینے، سونے، جاگنے جنسی رشتے استوار کرنے اور پیری کی منازل سے گزر کر موت کے دھندلکوں میں کھو جانے کا نام ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے علمبردار بن کر زندگی کے کارواں کے ساتھ چلتے اور ہر قدم پر خود غرضی کے شدید رجحانات کا مظاہرہ کرنے کو ہی حیات کا منتہا سمجھتے ہیں۔ دوسرا نظریہ اُن لوگوں کا ہے جو زندگی کو 'بیوپار' کا مترادف قرار دیتے ہیں اور جن کی دانست میں ہر اقدام کسی مستقل فائدے کے تابع ہونا چاہیئے۔ یہاں مسرت جہد للبقا میں کامرانی کا دوسرا

نام ہے ۔ لہٰذا اسے حاصل کرنے کے لئے تشدّد کے تمام اقدامات جائز اور ضروری تصوّر کئے جاتے ہیں ۔ اس دنیا میں امیر، غریب کو کچل دیتا ہے ۔ سرمایہ دار، مزدور کا خون پی جاتا ہے ۔ طاقتور حکومت، کم زور ریاست کو نگل جاتی ہے اور یوں اُس جذبے کو تسکین ملتی ہے ۔ جو تخریب اور فنا کا طالب ہوتا ہے ۔ چنانچہ یہاں مسّرت دوسروں کو کُچل کر کامرانی کے آستانے پر پہنچنے کے سوا اور کچھ نہیں ۔ زندگی سے متعلق یہ نظریہ بھی پہلے نظریئے کی طرح انسانیت کی اعلےٰ اقدار سے خاصا پست ہے ۔ اور اس کے ساتھ تطابق، حیوانی خواہشات کی تکمیل کا مُظہر ۔

زندگی سے متعلق تیسرا نظریّہ ایک ایسے فرد کا نظریّہ ہے جو زندگی سے کچھ حاصل کرنے کی بہ نسبت زندگی کو بہت کچھ تفویض کرنے کو ہی انسانیت کا اعلےٰ معیار قرار دیتا ہے ۔ چنانچہ وہ ہر قدم پر سماج کے ذہنی ارتقا اور افراد کی مسّرت وعظمت کو پیشِ نظر رکھتا ہے ۔ تاریخ بھی ایسے ہی لوگوں کو یاد رکھتی ہے جنہوں نے اجتماعی زندگی کو اپنی کسی پیش کش کے طفیل رعنائی بخشی لیکن یہاں بھی اس پیشکش کی مستقل حیثیت عارضی صورت گری کو پسِ پشت ڈال دیتی ہے اور اس لئے وہ لوگ انسانیت کے زیادہ محسن قرار پاتے ہیں ۔ جنہوں نے اپنی کسی پیشکش کے طفیل نہ صرف اپنی سوسائٹی بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی ہزارہا برس تک حصولِ مسرت کے مواقع بہم پہنچائے ۔ ایسے لوگوں میں

اُن فن کاروں کا درجہ انتہائی بلند ہے۔ جو آرٹ کی تخلیقات کے ذریعے اجتماعی مسرّت میں مستقل اضافے کے محرّک بن کر انسانیت کو بلند تر کرنے میں ممد ثابت ہوئے۔ زندگی کے متعلق اس انسانی نظریّے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطابق مسرّت کا حصول اتنا اہم نہیں جتنی کہ مسرّت کی تقسیم زندگی میں "فن" کا یہ اعلےٰ وارفع مقام کہ یہ اجتماعی مسرّت میں اضافے کا موجب قرار پائے، ادب برائے ادب اور ادب برائے حیات کے بیشتر بحث طلب مسائل کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ اور ہم صاف طور پر دیکھ لیتے ہیں کہ آرٹ کا مُقدّس فرض، بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کو ذہنی تسکین بہم پہنچانا ہے۔ آرٹ کیا ہے؟ یہ کسی حسّاس فرد کے اُس ذہنی ردِّ عمل کے کامیاب اظہار کا نام ہے جو ماحول کی کسی کروٹ کے طفیل معرضِ وجود میں آیا اور جس کے ذریعہ آرٹسٹ نے اپنے لطیف و جمیل احساسات کو اس خوبی سے اظہار کا جامہ پہنا کر دوسروں تک پہنچایا کہ دوسروں کو محسوس ہوا گویا وہ خود اپنے احساسات کا اظہار کر رہے تھے۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ اجتماعی مسرّت میں اضافے کے لئے آرٹ کی ہر تخلیق کو دو اہم فرض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ یہ تخلیق آرٹسٹ کے لطیف و جمیل احساسات اور گہرے تجربات کی ترجمانی کرے اور دوسرے ان کیفیات کو اس فنکارانہ انداز میں پیش کرے کہ ناظر اور آرٹسٹ کے احساسات ہم آہنگ ہو جائیں اور دونوں کے دل ایک ہی تال پر

دھڑکتے چلے جائیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آرٹ کا سب سے بڑا کام یہی ہے ــــــ ایک خوبصورت تصویر جو دیکھنے والے کو زندگی کا وہی منظر اُسی شدت اور انداز سے دکھلائے جس سے آرٹسٹ نے اُسے خود دیکھا تھا، ایک مدھر الاپ جو جذبات کی اُسی گہرائی اور احساس کی اُسی شدّت کو سننے والے تک پہنچائے جو اس کے خالق کے دل میں موجزن ہوئی تھی اور ایک اعلےٰ ادبی کاوش جو لکھنے والے کے احساسات ونظریات کو قاری تک اُسی رنگ میں پہنچائے جو اس کے خالق کی چشمِ تصوّر کا کرشمہ تھا ــــــ یہی آرٹ کا کام اور یہی اس کا مقام ہے اور یہی وہ انداز ہے جس پر چل کر آرٹ ابدی رنگ حاصل کرتا اور افراد کے دلوں کو بے پایاں اور لازوال مسرّت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔

یہاں اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ درحقیقت فن "کہانی کہنے" کی شدید ضرورت کے پیشِ نظر معرضِ وجود میں آتا ہے۔ یہ قطعاً دوسری بات ہے کہ یہ کہانی الفاظ کے سانچوں میں ڈھل کر نکلتی ہے۔ یا موسیقی کی لہروں کا روپ دھار کر یا تصویر کے لطیف وجمیل نقوش کی صورت میں۔ دراصل یہ کہانی کہنے والے کے غیر منتہی احساسات، خیالات اور جذبات کا سلسلہ ہے جسے

وہ دوسروں تک پہنچا کر دوسروں کو اپنے تجربات میں شریک کرنے کی سعی کرتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنی شدّت اور سچائی کہانی کہنے والے کے تجربات میں ہوگی، اتنی ہی تندہی سے وہ اُن کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی بھی کرے گا۔ اس سے اُسے ایک عجیب سی ذہنی تسکین حاصل ہوگی نفسیاتی طور پر کہانی کہنے والا اپنے ذاتی تجربات میں دوسروں کو شریک کرکے خود کو احساسِ تنہائی سے چھٹکارا دلانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ آرٹ کی تخلیقات کے لئے فنکارانہ اظہار کی بڑی ضرورت ہے کہ اس پر آرٹ کی کامیابی کا خاصا انحصار ہوتا ہے لیکن چونکہ اُن احساسات و تجربات کی سچائی، لطافت اور عمومیت بھی بہت اہم ہے جنہیں فنکار دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے لہٰذا آرٹ کی ہر تخلیق کو پوری کامیابی حاصل کرنے کے لئے دوہرا پارٹ ادا کرنا پڑتا ہے۔

انگریزی زبان کے ایک مشہور انشا پرداز نے بھی ایک جگہ آرٹ اور سائنس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آرٹ کی اصل قیمت محض اس کے فنکارانہ اظہار میں ہی نہیں بلکہ اُس قیمتی ذہنی اور احساسی سرمائے میں بھی ہے جو کسی تخلیق کے پسِ پشت موجود ہوتا ہے بلکہ وہ تو یہاں تک لکھتا ہے کہ آرٹ کی اعلےٰ تخلیقات صرف اس لئے اعلیٰ ہوتی ہیں کہ جوں جوں ہمارا ذہنی اُفق وسیع ہوتا ہے اور ہمارے تجربات بڑھتے ہیں توں توں ہم اُن کی

سچائی کے زیادہ قائل ہوتے چلے جاتے ہیں اور جتنا ہم خوبصورتی کو پرکھنے کے زیادہ قابل ہوتے ہیں اتنا ہی ہمیں ان تخلیقات کے حُسن کا زیادہ احساس ہونے لگتا ہے۔ لیکن اعلےٰ آرٹ کی تخلیقات کی خوبی یہ ہے کہ وہ بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر ایک کو اپنے سحر میں اسیر کر سکتی ہیں۔ بچے کو اپنے فنکارانہ اظہار کے طفیل اور بوڑھے کو اپنے قیمتی ذہنی سرمائے اور فنکارانہ اظہار کے امتزاج کے ذریعے —— اور اس سے کس کو انکار ہو گا کہ آرٹ کا وسیع اطلاق اجتماعی مسرت میں بے مثال اضافے کا موجب ثابت ہوتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اجتماعی مسرّت میں اضافہ آرٹ کا شعوری مقصد ہے۔ کیونکہ دراصل "انسان خود تخلیق نہیں کرتا بلکہ تخلیقی جوہر اپنے اظہار کے لئے انسان کو آلہ کار بنا لیتا ہے"۔ حیاتیاتی طور پر بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ چونکہ انسان کے قوائے ذہنی اس کی جسمانی نشو و نما کی بہ نسبت جلد ترقی کرتے ہیں۔ لہذا دوسرے جانوروں کے مقابلے میں اُسے زیادہ احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ جہاں جسمانی طور پر تو انسان جانور سے کئی گنا زیادہ وقت لے کر اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے وہاں ذہنی طور پر وہ جانور سے بہت زیادہ اور کہیں چھوٹی عمر میں ماحول کا ادراک کر لیتا ہے اُس کی جسمانی ترقی اور ذہنی نشو و نما کے مابین یہ تضاد اُسے اپنی کمزوریوں کا اس شدّت سے احساس دلاتا ہے کہ اُس کی زندگی کی ہر کاوش اس احساس

کمتری کو مفلوج کرنے اور اپنی تکمیل تک پہنچنے کے سوا اور کوئی مقصد اپنے پیشِ نظر نہیں رکھتی۔ ایسی کاوشوں میں اس کا یہ اقدام کہ وہ تنہائی سے گریزاں رہے۔ اور اجتماع و انبوہ میں زندگی بسر کرے، بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے چنانچہ ہر فرد سوسائٹی کے ساتھ کئی مستقل یا غیر مستقل رشتے قائم کرتا ہے۔ ان رشتوں میں گفتار، عقلی شعور، محبّت اور آرٹ کی تخلیقات زیادہ اہم ہیں کہ ان کے طفیل وہ دوسرے افراد سے ہم کلام ہو کر، اس احساسِ تنہائی سے چھٹکارا پاتا ہے۔ جو اس کی کمتری نے اس پر بزور عائد کیا تھا۔

لیکن زیادہ تر رشتے قدرت کی دین ہیں اور ان کی نمو میں انسان کی شعوری کاوشوں کو بہت کم دخل حاصل ہے۔ چنانچہ حیاتیاتی طور پر یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسان، جانور یا پودے میں کسی قسم کی کمی فوراً قدرتی طریق سے معاوضہ حاصل کر لیتی ہے۔ ایک بیمار پودا بہت جلد اور بڑی شدّت سے پھول نکالتا ہے تاکہ اپنی حیاتِ چند روزہ میں تکمیل کو پہنچ سکے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ تخلیقی جوہر کا دباؤ ان لوگوں میں شدید ہوتا ہے جو فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کمی کا بھی شکار ہیں۔ ادب کی تاریخ میں ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں — سُورداس اور مِلٹن کی بینائی زائل ہو چکی تھی۔ بیتھوون بہرہ تھا۔ بائرن لنگڑا تھا۔ اور کیٹس دِق کا مریض — چنانچہ بڑے فنکاروں کی زندگیوں کا اگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو

بیشتر اوقات اُن کے جسم یا کردار میں ایسی کوئی نہ کوئی کمی ضرور نظر آجائے گی کہ جسے پورا کرنے کے لئے قدرت نے اُن کے تخلیقی جوہر کو مہمیز دی اور وہ حیرت انگیز تخلیقات کے خالق بننے پر مجبور ہوئے۔

نفسیاتی طور پر آرٹ کی یہ تخلیقات اُن خواہشات کا اظہار ہیں جو حقیقت میں پوری نہ ہو سکیں اور جنہوں نے نفس لاشعور کا دامن پکڑ کر آرٹ کے ذریعے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن نفسیات کو بھی اس تخلیقی جوہر کے وجود کو تسلیم کرنا پڑا ہے۔ جو مصنف کی ہستی پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ بقولِ ریاض احمد ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ انسان تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ تخلیقی جوہر اپنے اظہار کے لئے ایک انسان کو آلہ کار بنا لیتا ہے" —— یہ تخلیقی جوہر وہی چیز ہے جسے ابوالکلام آزاد نے ادیب کی فکری انفرادیت کے ایک قدرتی سرجوش سے کہ جسے وہ دبا نہیں سکتا۔ اور مشہور چینی فلاسفر لن یوٹانگ نے تخلیقی اور فنکارانہ تحریک سے موسوم کیا ہے۔ مؤخرالذکر مصنّف کی رائے ہیں "ہم آرٹ کو اس وقت تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں جب تک کہ ہم اسے محض جسمانی اور ذہنی قوتوں کا وہ سرجوش تسلیم نہ کریں جو آزاد اور طوفانی ندی کی طرح کناروں سے چھلک جاتا ہے" اب ذہنی اور جسمانی قوتوں کا یہ سرجوش انسان کو کچھ نہ کچھ تخلیق کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم ایک سیّاح کے جذبۂ سیاحت یا ایک سائنسدان کے جذبۂ تحقیق سے موسوم کر سکتے ہیں

زیادہ موزوں الفاظ میں جس طرح بچہ جسمانی قوت کی فراوانی کے تحت چلتے چلتے کودنے لگتا ہے یا نوجوان اسی کے زیر اثر تھرکنا شروع کر دیتا ہے اسی طرح جسمانی اور ذہنی قوتوں کا کنارے توڑ کر بہہ نکلنا آرٹ کی تخلیقات کا موجب قرار پاتا ہے اور یہ سارا عمل اتنا غیر شعوری ہوتا ہے کہ آرٹ کے خالق کو خود پتہ نہیں چلتا کہ کس پُراسرار طریق سے ایک بلند پایہ چیز کی تخلیق ہو گئی۔

مگر اس سے یہ مراد لینا بھی درست نہیں کہ ایک اعلےٰ تخلیق از سرتاپا لاشعوری تحریکات کی مرہون ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس کسی تخلیق کو آرٹ کے اعلےٰ معیار پر پہنچنے کے لئے کچھ نہ کچھ شعوری کاٹ چھانٹ اور ردّ و بدل کی ضرورت یقیناً درپیش ہوتی ہے۔ ایڈیسن[٭] تو یہاں تک لکھتا ہے کہ کسی فن پارے کی تخلیق میں ننانوے فیصدی خون پسینہ اور صرف ایک فیصدی الہام کا عنصر ہوتا ہے بہرحال اس قدر تو وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں اعلےٰ تخلیق کی روح لاشعوری کیفیات سے متاثر ہوتی ہے۔ وہاں اس کے ڈھانچے کی تعمیر میں کسی نہ کسی حد تک فنکار کا شعور بھی دخل اندازی کرتا ہے۔

یہاں اگر جدید ترین نفسیاتی تحقیقات کی روشنی میں آرٹ کے پس منظر کی طرف رجوع کیا جائے تو ہم پر یہ منکشف ہو گا کہ آرٹ کی تخلیق دو مختلف ذہنی

٭ "IT IS ONE PERCENT INSPIRATION AND NINTY-NINE PERCENT PERSPIRATION" EDISON

منازل کے مابین اس "ربط" کا دوسرا نام ہے جسے آرٹسٹ اپنی شدتِ احساس اور نظرِ عمیق سے دریافت کر لیتا ہے۔ نفسیات نے اس چیز کو آرٹ کے عملِ مرابطہ کا نام دیا ہے اور اس کی توضیح یوں کی ہے۔ کہ جس طرح مزاح کی تخلیق دو مختلف اشیاء کے مابین ایک داخلی و خارجی ربط کی رہینِ منت ہے، اسی طرح آرٹ کی تخلیق کا راز بھی دو مختلف ذہنی منازل کے درمیان ایک ربط کی دریافت کا مرہون ہے۔ ان دو ذہنی منازل میں سے ایک تو وہ ہے جہاں روزمرہ زندگی خیالات کی سطحیت میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے اور دوسری وہ جو ہماری روزمرہ زندگی اور اس کی سطحیت کے پس پشت ایک وسیع و بسیط بحرِ بے کنار کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اور جس میں 'ابدیت' کے سارے عناصر سرگرمِ عمل ہیں۔ آرٹ کی تخلیق ان دو منازل کو مربوط کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ فنکار کوئی نئی چیز تخلیق نہیں کرتا بلکہ صرف دو چیزوں کے مابین ایک ایسا ربط پیدا کرتا ہے۔ جو اس سے قبل پیدا نہیں ہوا تھا۔ تشبیہہ و استعارہ جو ادب کی جان ہیں، اسی ربط کی بہت نمایاں مثالیں ہیں لیکن جہاں تشبیہہ و استعارہ یا مزاح کے ایک ٹکڑے میں صرف ایک وقتی حیرت کا عنصر ہوتا ہے وہاں فن مستقل حیرت کا امین ہوتا ہے اور فنکار اور ناظر دونوں کو یکے بعد دیگرے کئی حیرت زا لمحات ودیعت کرتا چلا جاتا ہے۔

تخلیقی جوہر (جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں) کا عمل اگرچہ غیر شعوری ہے لیکن یہ آرٹ کے خالق کو مسرّت سے ضرور ہم کنار کرتا ہے۔ نفسیات نے اسے اُس "تسکین" کا نام دیا ہے جو کسی چیز کی تخلیق سے حاصل ہوتی ہے چاہے یہ تخلیق ایک حسین بُت ہو یا حسین نظم یا حسین نغمہ، لیکن ویسے بھی یہ حقیقت ہے کہ "آمد" کے یہ لمحات جب کہ جسمانی اور ذہنی قوا سمٹ کر ایک نقطے پر جمع ہو جاتے ہیں اور انسان گرد و نواح سے بے خبر ہو کر، اپنی تخلیق میں یکسر کھو جاتا ہے، انتہائی ذہنی مسرت کے لمحات ہوتے ہیں یہ وہی لمحات ہیں جن کے متعلق ولیم ہیزلٹ جیسا جذباتی انشا پرداز بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے "—— آہ! بے قرار مسرّت کا وہ ایک لمحہ جب ذہن کو وہ نئی بات سوجھتی جو پھر کبھی مٹ نہیں سکتی! مجھ سے دنیا بھر کی کامرانیاں چھین لو۔ اور مجھے صرف دل سے نکلتی ہوئی وہ ایک آہ بخش دو جس کے طفیل کوئی نوجوان مصنّف ابدیت کو پہلی بار اپنی دلہن بناتا ہے ——" مگر ولیم ہیزلٹ جو اگرچہ اس بیکنار مسرّت کا تو قائل ہے، جو تخلیقی لمحات میں وارد ہوتی ہے۔ اس مسرّت کا بالکل قائل نہیں جو تخلیق کو دیکھ کر مصنّف کو محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ اُس کی رائے میں جب ایک بار کوئی چیز تخلیق ہو جائے تو اس کے خالق کے لئے نہ اس میں کوئی دلچسپی باقی رہتی ہے اور نہ مسرّت، بلکہ وہ تو یہاں تک لکھتا ہے کہ ایک آرٹسٹ کو بھی اپنی "تکمیل یافتہ تصویر" کو دیکھ کر وہ مسرّت حاصل نہیں ہو سکتی جو اس کی تخلیق کے دوران میں

اُسے حاصل ہوئی تھی ـــــــ مجھے ذاتی طور پر ولیم ہیزلٹ کے اس خیال سے اتفاق نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک اعلیٰ تخلیق اُس کے خالق کا ایسا قیمتی اثاثہ ہوتی ہے جسے وہ نہ صرف تا دمِ مرگ فراموش نہیں کر سکتا بلکہ جو بدلتی ہوئی زندگی کے ہر مقام پر اُسے بے پایاں مسرّت مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یا ممکن ہے ولیم ہیزلٹ نے انگریزی فضا میں بڑی خود اعتمادی کے تحت یہ الفاظ کہے ہوں ورنہ ہمارے ہاں تو یہ بات نہیں۔

تخلیق کے وقت مسرّت کی تحصیل یا تخلیق کا بعد ازاں جائزہ لیتے وقت مسرت کا حصول تو فنکار کو ضرور ارزانی ہوتا ہے، لیکن اس بات سے انکار نہ ہو سکے گا کہ تخلیقی کارناموں سے ہٹ کر فنکار کی زندگی مسرت کی اُس ملائم اور خوشگوار رَو سے ضرور محروم رہتی ہے۔ جو ایک درمیانے درجے کے خوش باش انسان کو حاصل ہوتی ہے اور اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ پہلی تو یہ کہ تخلیقی جوہر کا دباؤ فنکار کے سراپا پر اُس درجہ مُسلّط ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کے کرخت حقائق کا خوش اسلوبی سے ساتھ دینے کے زیادہ قابل نہیں رہ جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فنکار ارزاں قسم کی جذباتی تسکین کی خاطر بعض اوقات شراب نوشی کی طرف بھی مائل ہو جاتے ہیں آپ میں سے جن لوگوں کو مارگرٹ مچل کے مشہور ناول گان وِدوی وِنڈ کے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انہیں ایشلے کا وہ خوبصورت سا شاعرانہ کردار ضرور یاد ہو گا۔ جو فلکِ ناہنجار کے ایک ہی تھپیڑے کی بدولت زندگی

کے کرخت اور ہولناک حقائق سے دوچار ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے اُس کے لطیف اور سُبک خوابوں کا سارا رنگین طلسم ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوگیا۔ شاید کرشن چندر نے اپنے کسی افسانے میں لکھا ہے "یہ خواب بُرے نہیں ہوتے صرف ان کا ٹوٹ جانا بُرا ہوتا ہے۔ اور یہ سپنے بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں" —— اور فنکار کی زندگی میں اُداسی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کے سپنوں کے رنگین حباب، حقائق کے سنگریزوں سے اکثر ٹکرا جاتے ہیں۔

فنکار کی عام زندگی میں مسرّت کی کمی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اُس کا ذہنی عروج اُسے عوام کی سطح سے اس قدر بلند کر دیتا ہے کہ وہ خود کو سوسائٹی میں ایک اجنبی کے لباس میں دیکھتا ہے اور اُسے انبوہ میں ہوتے ہوئے بھی شدید احساسِ تنہائی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ زندگی میں مسرّت حاصل کرنے کے لئے یہ بڑا ضروری ہے کہ آپ اپنے ماحول کے افراد سے نہ ذہنی طور پر بلند ہوں اور نہ پست۔ کیونکہ اگر آپ پست ہوئے تو لوگ آپ کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں گے اور اگر آپ اُن سے بلند ہوئے تو وہ آپ سے بے اعتنائی برتنے لگیں گے —— اور فن کار کی ذہنی بلندی بھی اُسے انہی بدنصیبوں کے زمرے میں لا کھڑا کرتی ہے۔

لیکن جہاں فنکار کا یہ احساسِ تنہائی اُسے اوسط درجے کی خوش باش زندگی سے محروم رکھتا ہے۔ وہاں اس کا ردِّ عمل اپنے پُراسرار طریق کار کی بدولت اُس کی روح کے اِس خلا کو پُر کرنے اور اُسے احساسِ تنہائی سے چھٹکارا دلانے میں ضرور مدد بہم پہنچاتا ہے لیکن اس ردِ عمل کی نوعیت دو طرح کی ہوتی ہے اور اس لئے فنکار مختلف مدارج کا ادب پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں ایک وقت وہ خود کو ناظر کا لبادہ اوڑھا دیتا ہے اور زندگی کے ہنگاموں کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے وہاں دوسرے ہی لمحے میں وہ خود کو وسعت اور پھیلاؤ سے ہم آہنگ کرکے، اپنی محدود انفرادیت کو یکسر تج دیتا ہے اوّل الذکر لمحہ اُسے مزاح، تنقید اور طنز کی تخلیق کی طرف مائل کرتا ہے یعنی وہ تمام چیزیں جن کے ذریعے وہ ایک احساسِ برتری محسوس کرکے دوسروں کی ناہمواریوں پر ہنس سکے یا اُن پر طنز کرسکے یا مختلف اشیار کا تنقیدی جائزہ لے سکے۔ لیکن موخرالذکر لمحہ اُسے محض تماشائی کی حیثیت سے بلند کرکے ایسی احساسی چیزیں تخلیق کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ جن میں وہ خود کو کائنات کے وسیع پھیلاؤ اور لامحدود کیفیات سے ہم آہنگ کرسکے۔ نیچر شاعری بلکہ تمام داخلی شاعری کی تخلیق اسی ایک لمحے کی رہینِ منت ہے اور یہی وہ لمحہ ہے جسے صوفیائے کرام اور ویدانتیوں نے لامحدودیت کے ساتھ وصال کا لمحہ قرار دیا ہے یعنی جب امتیازِ من و تُو اٹھ جاتا ہے اور زندگی پھیلی

کر ایک سُہانے احساس میں بس جاتی ہے ۔

یہاں تک ہم نے فنکار کے احساسات سے بحث کی ہے اور یہ دیکھا ہے کہ تخلیق کے وقت فنکار ایک روحانی سرور سے ہم کنار ہوتا اور ایک مسرّت انگیز لمحے سے خود کو ہم آہنگ کر لیتا ہے ــــــ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تخلیق کے دوران جب وہ خیالات کی ایک لطیف سطح سے یک لخت اور لاشعوری طریق سے خیالات کی ایک لطیف تر سطح کو چھوتا ہے تو اُسے ایک ایسا مسرّت زا احساسِ وسعت ہوتا ہے جسے کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں "احساسِ بحرِ آسا" سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور دیکھا جائے تو یہی احساسِ وسعت فنکار کی عزیز ترین متاع اور اس کی بے پایاں مسرّت کا سب سے بڑا محرک ہے ۔

اب ہم تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھنے کی سعی کرتے ہیں کہ تخلیق شدہ آرٹ کیسے اور کہاں تک افراد کو مسرّت بخشنے میں کامیاب ہو سکتا ہے ؟

یہاں سب سے پہلے ہمارے لئے اس بات پر زور دینا نہایت ضروری ہے کہ درحقیقت آرٹ کی اصل روح اُس کی فطری آمد میں ہے، اور یہ روانی جب ہی آ سکتی ہے کہ فنکار اور فن کے متوالے اُسے کسی خاص ڈھب پر چلانے کی کوشش نہ کریں بلکہ اُس کی روانی کو آزاد چھوڑ کر فن کو اپنی سطح آپ

تلاش کرنے کی اجازت دیں۔" لہ

مولانا موصوف کا یہ عقیدہ کہ آرٹ کی رواں دواں ندی کے راستے میں بند باندھنے کی کوشش فضول ہے اپنی جگہ ایک خاصا وزنی نظریہ ہے۔ اور اس سے فن کی سچی کیفیات کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ فنکار اور اُس کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے والے افراد، اس حقیقت کی روح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آرٹ کو ہر طرح کی مقصدیّت" سے بلند و بالا قرار دیں اور اسے محض جسمانی اور روحانی قوتوں کا وہ سرجوش (OVERFLOW) تسلیم کریں جس کا کنارے توڑ کر بہہ نکلنا ایک فطری بات تھی نیز اسے اُس شدید تجربے کے مخلصانہ اور فنکارانہ اظہار سے موسوم کریں جس کے بغیر فنکار کا سانس رُک رہا تھا۔ اور جس میں شریک ہو کر خود افراد نے اُس تجربے کی گہرائیوں میں نہ صرف جھانکا بلکہ فنکار کے دوش بدوش اُس روحانی کیف و سرور کے جام بھی پئے جو فنکار کو اُس کی شدّت احساس نے فنی تخلیق کی صورت میں کسی ایک منزل پر پیش کر دیئے تھے۔

مولانا شبلیؔ نے بھی "شعر العجم" میں ایک جگہ آرٹ کی اس فطری آمد اور نتیجتاً افراد پر اس کے حیرت انگیز اثرات کے تذکرے میں لکھا ہے "شاعر کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔

لہ (صلاح الدین احمد)

جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ بلا شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو اُن کے دل پر اثر کریں گے لیکن شاعر نے اس مقصد کو پیشِ نظر نہیں رکھا تھا جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اُس کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سنائے لیکن اگر کوئی شخص سن لے تو ضرور تڑپ جائے گا۔"

یہاں یہ امر واضح رہے کہ کسی فن پارے کے شدید تاثر کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ افراد کے احساسات فن کار کے احساسات میں اپنا سچا عکس دیکھ کر ٹھٹھک جاتے ہیں۔ یہ چیز افراد کو بھی وہی ذہنی آسودگی بخشتی ہے جیسے فن کار نے اپنے جذبات و احساسات کے کامیاب اظہار پر حاصل کیا تھا اور اس میں نفسیاتی پیچ یہ ہے کہ کسی اعلےٰ تخلیق کا مطالعہ کرتے وقت ناظر کو محسوس یہ ہوتا ہے گویا وہ خود تخلیق کر رہا ہے۔ مسرت دراصل اس بات میں ہوتی ہے کہ فن کار جس چیز کا اظہار کرے، پڑھنے، سننے یا دیکھنے والا کہے گویا یہ اسی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس طرح فن کار کے تجربے میں شریک ہو کہ ناظر بھی فنکار کا ہمنوا بنتا اور مسرت حاصل کرتا ہے، چنانچہ جہاں ایک اعلیٰ فنی کاوش فنکار کے خلوص احساس کی غماز اور صداقتِ تجربات کی ترجمان ہوتی ہے۔ وہاں یہ ناظر کی سعی تخلیقِ مکرر کے پرتو سے بھی جگمگاہٹ حاصل کرتی ہے یوں تخلیق کا مداح تخلیق کو خود حرارت بخشتا اور اس کے احساسی سرمائے کو اپنی ذہنی اُڑان اور اپنے قیمتی ذہنی اور

احساسی سرمائے سے تقویت بخشتا ہے۔ ایسے مقام پر محسوس یہ ہوتا ہے۔ گویا دو، ایک سے اذہان نے کسی فن پارے کی تخلیق میں یکساں حصّہ لیا ہو۔ ان میں سے ایک ذہن تو خود فنکار کا تھا۔ اور دوسرا اُس شخص کا جس کے احساسات و تجربات کی سطح وہی تھی جو فنکار کی تھی اور جس نے خود کو فن کار کی ذہنی کیفیات سے یکسر ہم آہنگ پایا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے دل پسند مصنّف کی دریافت ہر ذہین فرد کی احساسی زندگی کا نازک ترین اور مسرّت انگیز مقام ہوتا ہے کہ اس سے اُسے وہ آئینہ مل جاتا ہے جس کے ذریعہ وہ خود اپنے احساسات، وجذبات کا جائزہ لیتا، اپنے تجربات کا دوسرے کے الفاظ میں اظہار کرتا اور یوں بے پایاں اور لازوال مسرّت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

لیکن جہاں اس بات کی سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ ہر فن پارے میں اشاریتی عنصر کی اتنی فراوانی ہوتی ہے کہ اس کے مطالعہ کرنے والے کو اپنی سعئ تخلیق بکار کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ اس فن پارے سے پوری طرح محظوظ ہو سکے۔ وہاں اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بعض فن پارے اپنے تیز بہاؤ میں ناظر کے احساسات وجذبات کو بہالے جاتے اور یوں اُس کے زورِ تخیل سے درخشانی حاصل کرنے کی بجائے خود اس کے تصوّرات میں چکا چوند پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ چیز ان لوگوں کو ارزانی ہوتی ہے جو زندگی کے کسی موڑ پر کسی

بڑے فن کار کی تخلیقات سے دوچار ہوتے اور آن واحد میں اُس کے اظہار کی کرشمہ سازیوں اور اُس کے خیالات و نظریات کی سحر انگیز کیفیات میں بکھیر کھو جاتے ہیں ـــــ یوں کہ انہیں محسوس ہوتا ہے گویا وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ اور زندگی ایک سہانے احساس میں بدلتی چلی جا رہی ہے۔

افراد کا کسی فن پارے کے سحر میں یوں اسیر ہو جانا کہ انہیں وقت کا احساس بھی باقی نہ رہے اپنے اندر ایک نہایت لطیف نفسیاتی وجہ رکھتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر فرد زندگی کے کرخت حقائق سے گریز اختیار کرنے اور خوابوں کے لطیف و جمیل محلکوں میں بسر اوقات کرنے کی طرف فطرتاً مائل رہتا ہے۔ چنانچہ ایک اعلےٰ فن پارہ اُسے یک لخت سنگلاخ حقائق کی دنیا سے بلند کر کے لطیف احساسات اور حسین خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے ـــــ ایک ایسی دنیا جس میں انسان خود کو فنکار یا ہیرو کے احساسات سے اس طور ہم آہنگ کر لیتا ہے کہ ہیرو کے مصائب اُس کے اپنے مصائب بن جاتے ہیں اور ہیرو کی کامرانی اس کی اپنی فتح! لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس ڈرامے کا ایک کردار بن کر انسان کو وہ مسرت کبھی ارزانی نہ ہو جو فی الواقع اُسے ملتی ہے۔ دراصل ہیرو کے ساتھ خود کو قطعی طور پر منسلک کرنے کے بعد بھی لوگ اپنی تماشائی کی حیثیت کبھی نہیں بھولتے۔ چنانچہ ہر بار ہیرو کے ساتھ آنسو بہانے اور مصائب اٹھانے کے بعد وہ اپنی تماشائی کی حیثیت کی طرف بھی لوٹتے

ہیں۔ یوں کسی فن پارے کے مطالعے میں یہ "لوٹ آنا" ایک ایسا موڑ بن جاتا ہے جس کا اگرچہ انہیں کوئی شعوری احساس نہیں ہوتا لیکن جو جذبات کے تناؤ کو آسودہ کر کے انہیں ذہنی تسکین مہیا کرتا اور خاص طور پر المیہ کی تاریکیوں کو اُن کے لئے گوارا اور ممکن بنا دیتا ہے۔

لیکن یہاں ایک حل طلب مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ آرٹ میں المیہ کا عنصر کیوں اور کیسے ذہنی آسودگی کا موجب ہے؟ اس کے جواب میں دو ایک نکات ملحوظ رکھے جائیں۔ تو بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ پہلا تو یہ کہ ہر فن کار، چاہے وہ افلاطون کے تخیلی نظریے کا حامی ہو یا ارسطو کے حقائق پسندانہ نظریے کا، کسی نہ کسی حد تک دروں بین (INTROVERT) ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ہر فنی تخلیق میں فن کار کے اپنے احساسات کو ضرور سرگرم ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر حقائق کا اجتماع تو ممکن ہے فنی تخلیق ممکن نہیں۔ اب ہر وہ فن کار جو اپنے احساسات کا جائزہ لیتا ہے ضرور ایک احساسِ تنہائی سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ یہ احساسِ تنہائی انسان کے احساسِ کم مائیگی کی پیداوار ہے۔ اور نفسیات میں اس کے متعلق دو آرا موجود نہیں ہیں۔ پھر یہی وہ احساسِ تنہائی ہے جو اپنی آسودگی کے لئے المیہ کی تخلیق کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ یہاں دوسرے کرداروں کو اپنے احساسات و جذبات تفویض کر کے فن کار ایک طرح سے ذہنی تسکین حاصل کرتا ہے۔ ناظر کا المیے سے تسکین حاصل کرنا بھی اسی نفسیاتی

عمل کا ایک پہلو ہے۔ کیونکہ ناظر بھی دراصل وہی انسان ہے جو احساسِ کم مائگی کا شکار تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ المیہ کی تخلیق اُن انسانی احساسات و جذبات کے اظہار کی خاطر معرضِ شہود میں آتی ہے جو انسان کے احساسِ کم مائگی کی پیداوار تھے۔ اور اظہار سے قبل اُس کے ذہنی کرب کا باعث۔ اظہار نے اُن کی شدت کو انحطاط پذیر کرکے نہ صرف فن کار کو ذہنی آسودگی بخشی۔ بلکہ ہر اُس انسانی ذہن کو بھی تسکین مہیا کی جسے احساسِ کم مائیگی و تنہائی نے مسرت سے محروم کر رکھا تھا۔

آخر میں مجھے فن سے حصولِ مسرت کے اس پہلو کا بھی تذکرہ کرنا ہے۔ جسے شبلی مرحوم نے محاکات کے زیرِ عنوان تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "شاعری کا اصل مقصد طبیعت کا انبساط ہے۔ کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے۔" دیکھا جائے تو شبلی مرحوم کے یہ الفاظ جو انھوں نے صرف شاعری کے ضمن میں کہے تھے، فن کی تمام مسلّمہ کیفیات پر پورے اُترتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہی فنی تخلیقات ہمیں زیادہ متاثر کرتی ہیں جو اصل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ اور جن میں سچائی اور خلوص کا عنصر بے پایاں ہوتا ہے۔ یہ تخلیقات دراصل زندگی اور اس کی تمام ترکیفیات کی صحیح نقل کرتی ہیں، ان کی سچی ترجمانی کرتی ہیں اور از بسکہ

انسان کو نقل یا ترجمانی سے محظوظ ہونے کی ایک قدرتی صلاحیت حاصل ہے اسلئے وہ فن سے کہ یہی دراصل زندگی کا سچا عکس ہے مسرّت حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو جاتا ہے ۔

مسرّت اور فلسفہ

والٹ وہٹ مین (WALT WHITMAN) ایک جگہ رقمطراز ہے

"میرا خیال ہے کہ میں حیوانوں کے ساتھ مل کر بڑے مزے سے رہ سکتا ہوں"۔

"وہ اپنی حالت کو سنوارنے کے لئے خون پسینہ ایک نہیں کرتے"۔

"نہ وہ طویل راتیں جاگ کر اور آنسو بہا کر بسر کرتے ہیں"۔

"خدا کی طرف بھی ان کے کوئی فرائض نہیں"۔

"ایک بھی تو بے چین نہیں۔ ایک بھی تو ملکیت کی خواہش نہیں کرتا"۔

"ان میں سے کوئی بھی تو کسی اپنے جیسے کے سامنے سر نہیں جھکاتا"۔

"ان میں سے ایک بھی عزت و ناموس کا پرستار نہیں۔ ایک بھی تو غمزدہ نہیں"۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہٹ مین کا یہ تاریک نظریہ حیوان کے مقابل انسان

کی تذلیل کے مترادف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حیوان اپنی سادہ اور طبعی زندگی کے باعث اُن آلام و مصائب اُن آنسوؤں اور سسکیوں سے بہت حد تک محفوظ رہتا ہے۔ جو انسان نے اپنے ذہنی ارتقا کے طفیل خود پر وارد کی ہیں لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ حیوانی لذت کو تج کر، انسان نے مسرّت کی اُن ارتقائی کیفیات تک بھی رسائی حاصل کی ہے۔ جہاں حیوان ہزار سعی کے باوجود پہنچنے سے قاصر ہے۔

دیکھا جائے تو مسرّت کا تصوّر شروع ہی سے اُس کے پیشِ نظر ہے اور وہ اُس کے حصول کے لئے ہر وقت کوشاں جنگل میں حیوانی زندگی بسر کرتے وقت وہ ذہنی الجھنوں سے بے شک محفوظ تھا اور اپنی فطرت کے اشاروں اور طبعی رجحانات کے تقاضوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اُسے وہ شدید لذّت بھی ضرور ملتی تھی جو حیوانی زندگی کا خاصا ہے۔ لیکن وہ یقیناً اُس مسرّت سے محروم تھا جس تک ایک روز اُسے ذہن کی نئی کروٹوں کے طفیل رسائی حاصل کر لینی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی اُس کی ذہنی ترقی نے اُس کے طبعی رجحانات کو پس پشت ڈالنا شروع کیا، اُس کی چشمِ تصوّر کے سامنے مسرّت کے نقوش واضح ہونے لگ گئے۔ جلد ہی اُس نے اپنے لئے تہذیب و قانون کی ایک ایسی دنیا تعمیر کر لی کہ جہاں اُس کے طبعی رجحانات پا بہ زنجیر رہ سکیں اور اُن کی تُندی و وحشت دائرۂ تہذیب میں آکر متوازن اور پُرسکون ہو جائے۔ لیکن وہ اپنی فطرت کے ان

اوّلیں تقاضوں کو یکسر ناپید نہ کر سکا۔ اور یہ تقاضے جنگ، جنسی وحشت اور انتقام کی صورت ہمیشہ اُس کے ساتھ وابستہ رہے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو ایک ننھی سی معصوم آرزو ہمیشہ اُس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔ کہ وہ کسی شام کے دھندلکے میں واپس اپنی کھوئی ہوئی جنّت یعنی جنگل میں چلا جائے، جہاں اُس کے جذبات کو کھلی چھوٹ ملتی تھی۔ اور جہاں وہ آزاد منش آدم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی خواہشات کی بلا روک ٹوک تسکین کر سکتا تھا لیکن اُس نے اپنی تہذیب بھری دُنیا میں اس آرزو کو بسا اوقات کچل دینے کی کوشش کی اور اصولاً جذبات وطبعی رجحانات کو فہم وادراک کے نہ صرف تابع قرار دے لیا، بلکہ ایک ایسی دُنیا بنانے کی بھی خواہش کی جہاں سے جذبات وطبعی رجحانات کو مکمّل دیس نکالا مل جائے اور یہی اس کی غلطی تھی۔ کیونکہ محض فہم وادراک کی زندگی اُسے وہ مسرّت یقیناً مہیا نہیں کر سکتی تھی جس کا وہ لاشعوری طور پر طالب تھا۔ سچی مسرّت تو عقل وجذبات کے امتزاج ہی سے ممکن تھی۔ اس کا مرکز نہ محض منطق و قانون تھا اور نہ محض جسم اور حیوانی زندگی۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا حیوانی زندگی میں مسرّت کا سوال ہماری بحث سے خارج ہے اور اس لئے کہ اس زندگی میں واقعتاً مسرت کا وجود ہی نہ تھا مسرّت کے حصول کا سوال تو انسانی زندگی کے اس مقام پر پیدا ہوا کہ جہاں اُس کے فہم وادراک کی ترقی نے اُس کے لئے بہت سی نئی ذہنی اُلجھنیں

پیدا کر دیں۔ اور اُسے اپنی کم مائگی تنہائی اور بے بسی کا احساس بری طرح ستانے لگا۔ چنانچہ جسمانی لذت تو اُسے اب بھی حاصل تھی لیکن وہ اُس "ذہنی لذت" سے یقیناً محروم تھا جو نئے شعور کے طفیل اُسے نئی دُنیا میں ملنی چاہئے تھی۔ اور اسی لئے اُس کے دل میں اس نئے خلا کو پُر کرنے کی ایک شدید آرزو کروٹیں لینے لگی۔ لیکن وہ اس خلا کو پُر کیسے کرے؟ اس نئے مرض کا علاج کیا ہو؟ یہ بے چینی کیسے دُور ہوگی؟ ——— یہ تمام سوالات ایک نئے انداز سے اُبھر کر اُس کے سامنے آ گئے۔ جلد ہی اُسے محسوس ہونے لگا کہ اس بے چینی کی وجہ تو وہ تاریکی ہے جو کائنات کے پُراسرار مسائل کے پیشِ نظر اُس کے ذہن پر مسلط ہے اور جسے چیر کر وہ صبح روشن کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے روشنی (LIGHT) ہی دراصل اُس کے اس نئے مرض کا علاج تھی۔ اور اسی روشنی میں، بقول اُس کے، وہ مسرت پوشیدہ تھی۔ جس کے لئے غیر شعوری طور پر وہ خود کو اس قدر بے قرار محسوس کر رہا تھا۔

چنانچہ انسانی ذہن کی ساری تاریخ اس پروانہ وار تگ و دو کا نام ہے۔ جو اُس نے روشنی تک پہنچنے کے لئے کی! ——— اسی تگ و دو کو ہم فلسفہ کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔

مغرب میں اس کا آغاز یونانی افکار سے ہوا۔ ہیر یکلیٹس HERACLITUS نے کہ جسے "آنسوؤں والا فلاسفر" کہا گیا ہے سب سے پہلے یہ نکتہ پیش کیا

کہ دُنیا میں تغیر کو ثبات ہے اور ہر چیز ایک پیہم تبدیلی سے ہم کنار ہے چنانچہ اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ کوئی شخص ایک ہی دریا میں دو دفعہ کود نہیں سکتا۔ کیونکہ دوسری بار کودنے تک، دریا کی پہلی صورت قائم نہیں رہے گی۔ یونان کے قریباً تمام اولین فلسفہ پر زندگی کا یہ تاریک رُخ مسلط ہے اور اسی قنوطیت کی بنا پر ہریکلٹس کو "آنسوؤں والا فلاسفر" کہا گیا ہے۔ لیکن انسان فطرتاً، پیہم تبدیل ہونے والی کائنات کے پسِ پشت ایک ایسی لامحدود ولازوال قوت کا بھی طالب ہے۔ جس میں ابدیت کے سارے عناصر موجود ہوں۔ چنانچہ اس دور کے یونانی فلسفہ میں بھی اس لامحدود قوت کو دریافت کرنے کی ایک واضح سعی کارفرما نظر آتی ہے۔

افلاطون نے جہاں ہریکلٹس کی یہ بات مان لی کہ کائنات کی ہر چیز پیہم تبدیلی سے ہم کنار ہے۔ وہاں یہ قیمتی اضافہ بھی کیا کہ دراصل ہمارے تجربات کی وہ دنیا جس کا ہم اپنے حواسِ خمسہ سے ادراک کرتے ہیں، پیہم تبدیل ہونے والی غیر حقیقی دُنیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے کہ جس کا ہم صرف ذہنی طور پر ہی ادراک کر سکتے ہیں۔ اس دنیا کی اشیاء حقیقی ہیں!

افلاطون کے مطابق "تخیل" ہی اصل چیز ہے۔ ورنہ وہ اشیاء جنہیں ہم حقیقی سمجھتے ہیں دراصل تخیل کی نقلیں (COPIES) ہیں بعینہٖ جس طرح پہاڑ کی تصویر دراصل پہاڑ نہیں بلکہ پہاڑ کی نقل ہوتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک کسی چیز کا تخیل، دراصل اُس چیز کی وہ خصوصیت ہے، جس کے بغیر اُس کا وجود تسلیم کر لینا ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر زندگی ان خصوصیات کا نام ہے نہ کہ اشیار کا۔ چنانچہ حسن ایک خصوصیت ہے کہ جس کے معیار پر کائنات کی ہر خوبصورت چیز پہنچنے کے لئے کوشاں ہے اسی طرح "نیکی" ایک خوبی ہے اور افلاطون کی نظروں میں یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ جس کی جھلک دُنیا کے پاکیزہ اور بلند لوگوں کی زندگیوں میں ملتی ہے۔

ارسطو نے کہ افلاطون کا لائق شاگرد تھا۔ جہاں اپنے اُستاد کے بنیادی نظریات کو وضاحت سے پیش کیا وہاں دُنیائے فلسفہ کو نئے نئے افکار سے بھی روشنی بہم پہنچائی مثلاً ایک نیا نکتہ جس پر اُس نے خاص طور پر زور دیا، یہ تھا کہ انسانی زندگی کا منتہا حصولِ مسرّت کے سوا اور کچھ نہیں کسی چیز کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مسرّت مہیّا کرے اس کے برعکس ہر وہ چیز بری ہے کہ جس سے مسرت کا حصول ممکن نہیں۔

اس سلسلے میں ارسطو نے زندگی کو تین صورتوں میں پیش کیا ہے زندگی کی پہلی صورت تو وہ ہے جس میں احساس کا وجود ہے، لیکن حرکت کا وجود نہیں مثلاً نباتات، دوسری صورت میں حیوانات شامل ہیں جو محسوس بھی کرتے ہیں۔ اور حرکت بھی تیسری صورت انسان کی مظہر ہے جو محسوس کرنے

اور حرکت کرنے کے علاوہ سوچ بچار بھی کر سکتا ہے۔ یہ تیسری خصوصیت صرف انسان ہی کو ارزانی ہوئی ہے اور یہی خصوصیت اُسے نباتات و حیوانات سے متمیّز بھی کرتی ہے۔ اب چونکہ انسان کو اُس کو اس امتیازی خصوصیت یعنی فہم و ادراک نے آغازِ کار ہی میں نباتات و حیوانات پر غالب آنے کی قوّت عطا کر دی ہے۔ لہٰذا قیاسِ اغلب ہے کہ اس خصوصیت کا ارتقا اور نکھار اُسے مسّرت اور سکونِ قلب عطا کرنے میں بھی نمایاں طور پر کامیاب ہو جائے گا۔

زیادہ صاف الفاظ میں ارسطو کہنا یہ چاہتا ہے کہ انسان کی مسّرت کا تمام تر دارو مدار اُس کی ذہنی کاوشوں پر ہے، اُس کے جذبات و احساسات پر ہرگز نہیں۔ لہٰذا مسّرت کے حصول کے لئے انسان کو چاہیئے کہ وہ جذبات و احساسات کا گلا گھونٹ دے اور محض ذہنی ارتقا کو اپنا مطمحِ نظر بنائے۔

ارسطو نے عقل و جذبے کے مابین جو تفریق پیدا کی اور جس طرح عقل کے مقابل عشق، یا جذبے کو کم ترین بلکہ گردن زدنی قرار دیا، اُس بحث کا آغاز ثابت ہوئی جو مغربی فلسفے کی تقریباً ساری تاریخ پر مسلّط ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اس بحث کے طفیل کبھی تو مفکّرین کا ایک ایسا گروہ پیدا ہُوا جس نے ہر شے کو محض عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی اور کبھی ایسا کہ جس نے محض جذبے کو سراہا اور عقلی منطق کو سراسر غلط راستہ قرار دیا۔ غور کیا جائے تو دورِ جدید میں فن برائے فن، اور فن برائے زندگی،

کی بحث دراصل سلسلۂ فکر کے اسی تضاد کی ایک صورت ہے جو ہمیشہ سے مغربی فلسفے کی تاریخ پر مسلّط رہا ہے۔

ارسطو، یونانی فلسفے کے بتدریج بلند ہوتے ہوئے سلسلہ ہائے کوہ کی آخری چوٹی تھا۔ اُس کے بعد اِس پُراسرار سرزمین یعنی یونان کو کبھی وہ روحانی عظمت نصیب نہیں ہو سکی۔ لیکن ارسطو کے فوراً ہی بعد یہ زوال شروع نہیں ہُوا۔ زینو ZENO اور اپی کیورس EPICURUS نے یونانی فلسفے کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو چند دے اور جلائے رکھا اور زندگی سے متعلق دو ایسے مختلف اور متضاد نظریے پیش کئے جو بعد ازاں ایک طویل کش مکش کا باعث بھی ثابت ہوئے۔ اِن میں سے زینو کا نظریہ تو صریحاً شکست کی آواز تھا کیونکہ زینو کے مطابق انسان کا فرض یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے تگ و دو کرتا پھرے اور زندگی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے بلکہ یہ کہ وہ اپنی موجودہ زندگی پر قانع رہے اور اپنی خواہشات کے پاؤں کو چادر کے مطابق ہی پھیلائے۔

اس کے برعکس اپی کیورس ایسی شکست خوردہ زندگی کا قائل نہ تھا۔ اُس کی نظروں میں مسرت کے لئے تگ و دو ہی زندگی کا آخری منتہا تھا —— وہ مسرّت نہیں جو جسمانی لذّت کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسی مسرّت روح کو بے چین کر دیتی ہے۔ بلکہ وہ مسرّت جو انسان کی ذہنی آسودگی کا باعث

بنتے ہوئے اُسے سکون اور شانتی سے قریب تر کر دے۔

رومیوں نے جب ۱۴۶ قبل از مسیح میں یونان پر حملہ کیا تو دیکھا کہ یہ دونوں مدرسہ ہائے فکر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ واپس لوٹے تو جیسا کہ فاتح کا قاعدہ ہوتا ہے، وہ ان دونوں نظریوں کو بھی اپنے ساتھ روم لے آئے۔

بعد ازاں روم نے جو تھوڑا بہت فلسفہ پیش کیا وہ ان ہی نظریوں کے تصادم کی ایک تصویر تھا۔

سلطنتِ روم کے خاتمے کے بعد قریباً ایک ہزار سال کا عرصہ فلسفے کی تاریخ میں تاریکی کا زمانہ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ کلیسا کی طاقت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ایک سلطنت کے بعد دوسری سلطنت اور ایک ملک کے بعد دوسرا ملک کلیسا کے تحت آتا چلا گیا تا آنکہ یورپ کا بڑا حصہ روحانی اور جسمانی طور پر اُس کے بے رحم پنجوں میں اسیر ہو کر رہ گیا۔ تیرھویں صدی کے آغاز میں تو قریباً یورپ کا ۳/۴ حصہ کلیسا کے قبضے میں آ چکا تھا اور زندگی ایک تاریک سا خول بن کر رہ گئی تھی۔

لیکن اس سب کا ردِ عمل بھی ضروری تھا اور یہ ردِ عمل ایک پُر اسرار طریق سے ہوا۔ یکایک زمین کی زرخیزی بڑھ گئی اور زمین کی زرخیزی کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن بھی یک لخت زرخیز ہو گیا۔ جرمنی سے ایک آواز اٹھی اور اس آواز

نے گویا کلیسا کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن یہ صرف ایک شخص کی آوازنہ تھی
یورپ بحیثیت مجموعی تاریکی کی سنگین دیواروں کو توڑ کر باہر نکل رہا تھا۔ پریس
اور صلیبی جنگوں نے ذہنی افق کو وسیع کرنے میں مدد بہم پہنچائی اور احیاءُ العلوم
(RENAISSANGE) کی ایک ہی برقی رو نے سارے یورپ کو جھٹک
کر بیدار کر دیا۔

یہی زمانہ فلسفے کے دَورِ جدید کے آغاز کا بھی زمانہ ہے اور اس کی پہلی آواز
انگلستان کے ایک شخص نے بلند کی کہ جس کا نام فرانسس بیکن FRANCIS
BACON تھا۔

فرانسیسی بیکن نے زندگی کے تمام معمّوں کو حل کرنے کے لئے سائنس اور
منطق کا سہارا لیا اور یوں ایک ایسے سلسلۂ فکر کی بنیاد رکھی جس نے
عقل و فہم پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اور عملی میدان میں ذاتی مشاہدہ اور تجربہ
کے معیار مقرر کر کے، تاریکیوں کو چیرنے کی سعئ جمیل کی۔ بیکن، ڈیکارٹ،
سپائی نوزا، والٹیر لاک اور ہیوم اسی سلسلۂ فکر کی مختلف آوازیں
تھیں۔

بیکن نے جہالت کو غم اور دکھ کا موجب قرار دیتے ہوئے تحصیلِ علم پر
زور دیا اور کہا کہ مسرت، اشیاء کی ماہیت دریافت کرنے سے ہی ممکن ہے
چنانچہ جہاں زمانۂ قدیم میں فلسفہ کا مقصد، بدلتی ہوئی زندگی کے پس پُشت

ایک لازوال و غیر مرئی ہستی کی دریافت تھا وہاں فرانسس بیکن کے ساتھ فلسفہ شک و شبہ کے میدان میں داخل ہوا اور منطق اور سائنس کے ذریعے اور عقل و خرد کی روشنی میں، ہر چیز کی ماہیت دریافت کرنے کے نمایاں رجحانات پیدا ہو گئے۔

فرانسس بیکن کی طرح ڈیکارٹ (DESCARTES) نے بھی اپنے فلسفہ کا آغاز شک و شبہ سے کیا لیکن اُس کے شک و شبہ نے تو بہت جلد اس قدر وسعت اختیار کر لی کہ کائنات کی ہر شئے اس کی لپیٹ میں آ گئی ــــ البتہ وہ اپنی ہستی پر شبہ نہ کر سکا اور اس بات کا اُس نے اپنے مشہور مقولے میں اظہار بھی کر دیا "میں سوچتا ہوں، لہٰذا میں موجود ہوں"۔ اور اسی بنیاد سے اُس نے کائنات کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کی ــــ وہ کائنات جس کا وجود انسانی ذہن کا رہینِ منت ہے، وہ کائنات نہیں جس کا ہم اپنے حواسِ خمسہ سے ادراک کرتے ہیں۔ کیونکہ حواس خمسہ ہمیں دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔

ڈیکارٹ نے خدا کی ہستی کے علاوہ ذہن اور مادہ کے الگ الگ وجود بھی تسلیم کئے اور ان کے ایک دوسرے پر اثرات واضح کرنے کی سعی بھی کی لیکن بات بن نہ سکی۔

ڈیکارٹ کے بعد یہودی فلاسفر سپائی نوزا SPINOZA نے، جسے اُس کے عجیب نظریات کی بنا پر یہودیت سے خارج کر دیا گیا تھا، مادہ اور ذہن کو

الگ الگ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ سپائی نوزا کے مطابق کائنات میں صرف ایک ہی ہستی کا وجود تھا، مادہ اور ذہن اُس کی محض خصوصیات تھیں،

"ہر چیز خدا کی مظہر ہے۔ اور اس کی ہستی کے اندر رہتی اور حرکت کرتی ہے"

"جو نسبت دائرے کے قانون کو تمام دائروں سے ہے وہی نسبت خدا کو اُس کی کائنات سے ہے۔"

"سب سے بڑی مسرت اس بات میں ہے کہ ذہن اور کائنات کے ازلی وابدی ملاپ کا علم حاصل کیا جائے۔"

ان نظریوں کی بدولت سپائی نوزا اپنے ہمعصر فلاسفروں سے بہت بلند نظر آتا ہے اور بعض بعض مقامات پہ تو وہ ویدانت اور تصوف کے عظیم نظریات کے بھی بہت قریب پہنچ جاتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ محض ایک فلاسفر ہے جس نے ذہن کی قوتوں سے کائنات کے معمے کو حل کرنے کی سعی کی ہے، وہ اپنے احساسات کو کائنات کی لامحدودیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کرتا چنانچہ اُس کے نظریات کی تمام تر اساس فہم وادراک پر اُستوار ہے، احساس و تجربہ پر نہیں۔

بہر حال سپائی نوزا بھی مسرت کو ہر کاوش کی منزل قرار دیتا ہے اور مسرت کی توضیح اس طرح کرتا ہے کہ یہ ایک کیفیت ہے جو انسان کو تکمیل کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب وہ تکمیل کے کسی مقام

سے نیچے گرتا ہے تو اُسے غم محسوس ہوتا ہے۔

سپائی نوزا کے مطابق ہر طبعی رجحان فرد کی بقا کا ضامن ہے۔ چنانچہ اگر طبعی رجحان کی تسکین ہو جائے تو فرد لطف محسوس کرتا ہے۔ اور اگر یہ تشنہ رہ جائے تو اُسے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ہم اشیا کی خواہش اس لئے نہیں کرتے کہ ہمیں ان سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ چونکہ ہم اُن کی خواہش کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ ہمیں مسرّت بہم پہنچاتی ہیں۔ اور ہم اس لئے ان کی خواہش کرتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔

لیکن یہ مجبوری کیوں؟ چنانچہ سپائی نوزا حصولِ مسرّت کے لئے انسان کو طبعی رجحانات اور خواہشات سے بلند ہو جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اُس کے پاس اعلےٰ انسان (SUPERMAN) کا تصوّر یہ ہے کہ وہ ہر خواہش سے بلند ہوتے ہوئے خود پر پوری طرح سے قادر ہو۔ صرف ایسی صورت ہی میں وہ صحیح مسرت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

مجموعی طور پر سپائی نوزا نے بیکن اور ڈیکارٹ کے نظریات کو وسعت بخش کر، تمام کائنات کو ریاضی کے ازلی و ابدی قوانین کا ایک نمونہ ثابت کیا اور اسے سمجھنے کے لئے علم و خرد کا دامن تھام لینے کی نمایاں طور پر ترغیب دی۔

سپائی نوزا کے بعد والٹیر لیسنگ، ہابز (HOBBES) اور دوسرے

فلاسفروں نے خرد کی روشنی کو تیز تر کرنے کی کوششیں جاری رکھیں اور مادہ پرستی پروان چڑھتی رہی۔

لیکن جان لاک (LOCKE) نے اس عام سطح سے ذرا بلند ہونے کی کوشش کی اور خرد کے دبستے کو زیرِ بحث لاکر فلسفے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ لیکن مجموعی طور پر مادہ پرستی کا وہی عالم رہا۔ لاک نے انسانی ذہن کو ایک سپید کاغذ سے تشبیہہ دی جس پر تجربات اثر انداز ہوتے ہیں، حسیات کے نقوش ابھرتے ہیں، قوتِ یادداشت بیدار ہوتی ہے اور خیالات معرضِ وجود میں آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا علم صرف ہمارے حواسِ خمسہ کا مرہون ہے۔ اب چونکہ صرف مادی اشیا ہی ہمارے حواسِ خمسہ پر اثر انداز ہو کر ہمارے ذہن کی تشکیل میں مدد بہم پہنچاتی ہیں۔ لہذا کائنات میں سوائے مادہ کے اور کسی چیز کا وجود نہیں۔

"لیکن یہ غلط ہے" پادری برکلے بے اختیار پکار اٹھا "اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ زندگی مادے کے سوا اور کچھ نہیں بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ چونکہ مادے کا علم ہمارے حواسِ خمسہ کا رہینِ منت ہے۔ لہذا اگر مادے کا وجود ہے تو صرف ہمارے ذہن میں ہے"—— برکلے کی منطق بڑی غیر معمولی تھی اور اس نے اس کا سہارا لے کر تمام کائنات کو خدا کے ذہن میں ایک "خیال" قرار دیتے ہوئے مادہ پرستی پر کاری ضرب لگانے

کی سعی کی ۔

لیکن ڈیوڈ ہیوم (DAVID HUME) نے چھبیس[۲۶] برس کی عمر میں برکلے کے سارے فلسفہ کو ایک ہی وار میں مٹا کر رکھ دیا۔ ہیوم نے کہا کہ ذہن تو محض نام ہے خیالات کے تسلسل کا ۔ ہمارا مشاہدہ، یادداشت اور احساس ہمارے ذہن میں نہیں، بلکہ خود ہمارا ذہن ہیں ۔ خیالات کے پسِ پُشت 'روح' کا وجود مضحکہ خیز ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جس طرح برکلے نے مادے کے وجود کو ختم کر دیا تھا، ہیوم نے ذہن کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ہے اور مغربی فلسفے کا وہ قصر جسے بیکن اور ڈیکارٹ نے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا تھا محض ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا ۔

اور یہاں پہنچ کر مغربی ذہن نے ایک نمایاں کروٹ لی اور فلسفے کے اُفق پر ایک دُبلے پتلے فرانسیسی کے نقوش واضح ہونے شروع ہو گئے ——
یہ فرانسیسی جین جیکوئز روسو (JEAN JACQUES RUUSSEAU) تھا ۔

روسو مادہ پرستی اور عقل و منطق کے تسلط کے خلاف ردِعمل کی علامت تھا ۔ اُس کی دانست میں ہر شئے کو محض عقل و منطق کے ترازو پر تول کر اس کی ماہیت پر حکم لگانا درست نہیں تھا ۔ کیونکہ زندگی میں ایسے لاینحل اور مشکل مسائل بھی ہیں جنہیں انسان کے طبعی رجحانات، اُس کے جذبات

واحساسات کی غیر شعوری قوتیں ہی حل کر سکتی ہیں۔ چنانچہ روسو نے صاف اور واضح الفاظ میں دنیا کو بتا دیا کہ محض عقل و منطق پر ہر لحظہ بڑھتا ہوا اعتماد درست نہیں۔ اس کے مقابل انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ "دِل" کی دُنیا کو وسعت بخشنے کی کوشش کرے —— روسو کے مطابق اگرچہ عقلی طور پر خدا کے وجود کو تسلیم کرنا مشکل ہے لیکن چونکہ ہمارا دل خدا کے وجود کا پوری طرح قائل ہے لہذا کیوں نہ انسانی عقل کے مقابل، انسان کے احساس و جذبے پر یقین کامل رکھتے ہوئے خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے۔

روسو نے جب اپنے انقلابی خیالات کی وہ کتاب جس کے مطابق انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے طبعی رجحانات کی دُنیا کو لوٹ جائے، بوڑھے والٹیر کی خدمت میں بھیجی تو والٹیر نے جواب میں لکھا۔

"جنابِ من! حضرتِ انسان کے خلاف لکھی ہوئی آپ کی کتاب مجھے ملی شکریہ! آپ نے بڑے سلیقے سے ہمیں حیوانوں کے زمرے میں شامل ہو جانے کی دعوت دی ہے۔ آپ کی کتاب پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ فوراً پنجوں کے بل چلنا شروع کر دیا جائے۔ لیکن افسوس کہ پچھلے ساٹھ برس سے صرف ٹانگیں استعمال کر رہا ہوں۔ اب اس پیرانہ سالی میں بچپن کی عادات کیسے قبول کر سکتا ہوں؟"

لیکن جرمن فلاسفر کانٹ KANT تک جب روسو کی نئی کتاب پہنچی۔

تو اُسے اپنی روزانہ چہل قدمی کا بھی خیال نہ رہا۔ اور اس نے ایک ہی نشست میں ساری کتاب ختم کردی۔ کانٹ کے لئے یہ ایک نیا احساسی تجربہ تھا۔ کہ دنیا کے کسی گوشے میں کوئی اور دل بھی اسی تال پر دھڑک رہا تھا جس پر اُس کا اپنا دل۔ چنانچہ کانٹ کے فلسفے نے رُوسو کے خیالات سے ایک نئی تحریک حاصل کی۔

سب سے پہلے تو کانٹ نے اس بات سے انکار کیا کہ ہمارا ذہن محض ایک موم کی تختی ہے جس پر حسیات و تجربات اپنے نقوش ابھارتے ہیں۔ "علم محض حسیات و تجربات کا رہین منت نہیں، یہ ان سے ماورا بھی ہے"۔ کانٹ نے انسانی ذہن کو اُس جرنیل سے تشبیہ دی ہے جو میدانِ جنگ میں کھڑا ہوا اور حسیات و تجربات کی بے ترتیب لہروں کو اُن پیغامات سے جو میدانِ جنگ کے مختلف حصوں سے اُس تک پہنچ رہے ہوں۔ اب یہ پیغامات ازخود ہی جرنیل کے آخری حکم کی صورت اختیار نہیں کر جاتے بلکہ جرنیل ان الجھے ہوئے پیغامات کو سلجھا کر ایک نتیجہ پر پہنچا اور آخری حکم جاری کرتا ہے (نہیں) کانٹ کے مطابق حسیات و تجربات کو سلجھانا ہمارے ذہن کی ایک "مخفی قوت" کا کرشمہ ہے اور یہ اس قوت کا ایک نمایاں مقصد PURPOSE OF MIND ہے جو کائنات کو تنظیم سے ہم کنار کرتا ہے ورنہ کائنات کی اشیاء کا ازخود ایک سلسلہ تنظیم میں منسلک ہو جانا محلِ نظر ہے۔

مختصر الفاظ میں کانٹ کے فلسفے کا لب لباب یہ ہے۔ کہ ہمارا ذہن محض ہماری حسیات کا مرہون نہیں بلکہ یہ تو ایک ایسی طاقت ہے جو حسیات و تجربات کو سلجھانے اور منظم کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔

ذہن کی اس "مخفی قوت" کو کانٹ نے بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ وہ اُن اعمال کو نیک متصور نہیں کرتا جو واقعتاً اچھے ہوتے ہیں۔ بلکہ صرف انہیں جن کے لئے ہمارا ضمیر ہمیں ابھارتا ہے۔ دنیا میں بہترین بات یہی ہے کہ ضمیر کی اس آواز پر، آنکھیں بند کر کے عمل کیا جائے۔ چنانچہ کانٹ نے شخصی یا ذاتی مسرت کو ثانوی حیثیت دی ہے۔ اُس کے مطابق فرد کو چاہیئے کہ وہ دوسروں کی مسرت کو پیش نظر رکھے لیکن جہاں تک اُس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، اُس کے پیش نظر صرف اپنی تکمیل اور ارتقا ہونا چاہیئے۔ چاہے اس عمل سے اسے مسرت ارزانی ہو یا نہ ہو۔

مسرت کے اس سوال پر کانٹ کے ہمعصر جے بینتھم J. BENTHEM- کا نظریہ بھی قابل ہے۔ بینتھم کے مطابق اجتماعی مسرت ہر حال میں مقدم ہے اور اعمال کا نیک یا بد ہونا صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک زیادہ یا کم مسرت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ تھیوری اخلاق اور انصاف پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اعمال کا منتہا صرف زیادہ سے زیادہ مسرت کا حصول نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بعض اور اقدار کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں مثال

کے طور پر ایک شخص جس کے پاس آپ کی کچھ رقم بطور امانت پڑی ہے، آپ کو واپس دینے سے انکار کر دے اور یہ کہہ کر اُسے لوگوں میں تقسیم کر دے کہ اس سے اجتماعی مسرت میں اضافہ ہوگا تو اِس سے سوسائٹی کی بنیادوں کے متنزلزل ہو جانے کا خطرہ ہے۔

مسرت کے اس سوال کو جان سٹوارٹ مل (JOHN STUART MILL) نے بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مِل کی دانست میں صرف زیادہ سے زیادہ مسرت کا حصول انسانی اعمال کا منتہا نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ چاہے کم مسرت حاصل کرے لیکن اس مسرت کا معیار خاصا بلند ہو۔

مجموعی طور پر کانٹ نے خرد پر اعتراض کر کے اور احساس کو اہمیت دے کر وہ راستہ صاف کر دیا کہ جس پر ہیگل اور شوپنہادر اور نطشے اور برگساں نے سفر کر کے فلسفے کی نئی نئی پگڈنڈیاں دریافت کیں۔

ان میں سے ہیگل HEGEL تحرک اور حرکت کا علم بردار تھا اور اس کی دانست میں کشمکش ہی ارتقا کے مختلف مدارج کی ضامن تھی۔ چنانچہ ہیگل کی نظروں میں زندگی کا منتہا مسرت نہیں بلکہ تحصیل اور فتح (ACHIEVEMENT) تھا۔

" دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسرت، امن اور خوشحالی کے ادوار

تاریخی اعتبار سے جمود کے ادوار ہیں اور یہ چیز انسان کی شان کے منافی ہے"
ہیگل کے مطابق تضاد اور تفریق ہر جگہ نمایاں ہے اور انسانی ذہن اور فلسفے کا کام اس تضاد اور تفریق کے پس پشت تنظیم اور ایکتا کی دریافت ہے اسی طرح مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اُس کل کا احساس و ادراک کرے جس میں تضاد اور تفریق کے تمام مظاہر متحد ہو کر ایک ہو جاتے ہیں اور ذہن و مادہ، فاعل و مفعول اور نیک و بد میں قطعاً کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ آیا ہوں روسو کے ساتھ فلسفے کا وہ دَور شروع ہو گیا تھا جس میں خرد کے مقابل احساس کو زیادہ وقعت مل رہی تھی۔ اِس سلسلے میں کانٹ نے ذہن کی "مخفی قوت" کا نام لیا تھا جو ذہنی استدلال سے ماوراٗ تھی اور جو حسیات و تجربات کو از خود سلجھاتی اور منظم کرتی چلی جاتی تھی۔ اس ضمن میں اگلا قدم شوپنہاور (SCHOPENHAUER) نے اُٹھایا جب اُس نے اس بات کا اظہار کیا کہ ہم کسی چیز کی خواہش اس لئے نہیں کرتے کہ اس خواہش کے جواز میں چند دلائل پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں۔ بلکہ ہم چونکہ کسی چیز کی خواہش کرتے ہیں لہذا اس خواہش کے جواز میں خود ہی پہلے دلائل پیدا کر لیتے ہیں۔ بڑی چیز وہ خواہش ہے جسے اُس نے UNCONSCIOUS WILL[1] کا نام دیا ہے اور جو سارے انسانی افعال و اعمال کے پس پشت سرگرم ہے۔ چنانچہ انسانی اعمال اُس کے ذہن کے نہیں بلکہ

[1] خواہش مجہول

دل کے تابع ہیں۔

انسان کیا ہے؟ خواہش کا آلہ کار ——— وہ خواہش جس کی کبھی تسکین نہیں ہو سکی۔ چنانچہ جب تک وہ خواہش کے اشاروں پر ناچتا رہے گا، اُسے کبھی ابدی مسرّت حاصل نہیں ہو سکے گی۔ انسان کا یہ خیال غلط ہے کہ خواہش کی تسکین سے اُسے مسرّت حاصل ہو جائے گی اور یہ اس لئے کہ دراصل ہر خواہش سینکڑوں دوسری خواہشات کو کروٹ دیتی چلی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر انسانی خواہش ایک پیاسی خواہش ہے جو کبھی سیراب نہیں ہوئی۔

شوپنہادر نے مسرّت کو منفی قرار دیا ہے۔ اُس کی دانست میں مسرّت غم کے فقدان کا نام ہے۔ اصل چیز غم ہے جو مثبت ہے اور جو انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جتنا حسّاس کوئی شخص ہوگا اتنا ہی غم کا اور اس کا چولی دامن کا ساتھ ہو جائے گا۔ "وہ جو علم میں اضافہ کرتا ہے دراصل غم میں اضافہ کرتا ہے۔" دنیا کی کوئی چیز اس قابل نہیں کہ اُسے حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کی جائے۔ یہاں ہر چیز فضول ہے، بے کار ہے اور بے مصرف، محبت، رفاقت، وطن پرستی سب کچھ فریب ہے۔ صرف وہی شخص یہاں خوش رہ سکتا ہے جو نوجوان کی طرح جاہل ہو۔ کیونکہ نوجوان سمجھتا ہے کہ خواہش کرتے جانا ہی مسرّت ہے اور نہیں جانتا کہ خواہش کے خاتمے پر حقیقت کا آسیب بھی رہتا ہے۔ اسے ابھی شکست کا احساس نہیں ہوا۔" شوپنہادر کے مطابق

خود کشی ہی انسان کا آخری سہارا ہے۔ یوں انسان کی ذہنی قوتوں، کو اُس کے طبعی رحجان پر فتح حاصل ہوتی ہے لیکن یہ فتح انفرادی نوعیّت کی ہے اور فرد کی موت کے بعد بھی زندہ رہنے کی خواہش دوسرے افراد میں متحرک رہتی ہے۔ زندگی کے مصائب پر، بقول شوپنہاور، کبھی پوری فتح حاصل نہیں ہو سکتی جبتک کہ اس خواہش کو ذہنی قوتوں کے تابع نہ کر دیا جائے۔

البتہ شوپنہاور نے آرٹ کو بہت سراہا ہے۔ کیونکہ اُس کے مطابق آرٹ ہمیں انفرادیت سے بلند کر کے اور یوں مادی اور جسمانی خواہشات سے اوپر اُٹھا کر، سچائی کی دریافت کی طرف مائل کرتا ہے۔ آرٹ اور سائنس میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ سائنس مادی حقائق سے منزل کی طرف بڑھتی ہے۔ اور آرٹ ایک ہی جست میں منزل پر جا پہنچتا ہے۔ چنانچہ جہاں سائنس کے لئے ایک اعلےٰ دماغ بھی کام دے سکتا ہے۔ وہاں آرٹ کے لئے خالص جینیس (GENIUS) کی ضرورت ہوتی ہے۔ آرٹ، تغیّر اور انتشار کے پسِ پشت ابدیت کی جھلک دکھا کر ہمیں مکروہات دُنیا سے آزاد کرتا اور یوں ہماری مسرت کا ایک بہت قریبی رفیق ثابت ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر شوپنہاور نے خواہش کو ہمارے آلام و مصائب کا منبع اعظم قرار دیا اور اُس سے آزادی حاصل کرنے کو انسان کا سب سے بڑا کارنامہ تسلیم کیا چنانچہ اُسے بدھ ازم سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ نروان یعنی خواہشات کے خاتمے کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔

دیکھا جائے تو شوپنہاور کا فلسفہ ایک نیوراتی انسان کا فلسفہ ہے۔ ویسے بھی شوپنہاور کی زندگی شروع سے آخر تک تنہائی سے ہم آہنگ رہی۔ اُس کی ماں نے اُس سے نفرت کی اور اُس نے ردِّ عمل کے طور پر عورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اُس کی کوئی بیوی نہ تھی، کوئی بچہ نہ تھا، کوئی دوست، رفیق یا غمگسار نہ تھا۔ کوئی وطن یا ملک نہ تھا۔ وہ ازل اور ابد کے مابین ایک ٹنڈ منڈ درخت کی طرح اکیلا کھڑا تھا۔ زندگی نے اُسے کچھ نہ دیا اور اُس نے زندگی کے تمام رنگین پردے چاک کر ڈالے اور دنیا کے سامنے اُس کی ایسی گھناؤنی اور مکروہ صورت پیش کی کہ دل والوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

تو یہ تھا شوپنہاور ——— زندگی کا زیرک ناظر لیکن بھٹکا ہوا ٹھکرایا ہوا ——— راہی!!

شوپنہاور کہنے کو تو مر گیا لیکن اُس کا ازلی وابدی غم کبھی مر نہ سکا۔ اُس نے زندگی کی جو بھیانک تصویر پیش کی وہ کبھی مٹ نہ سکی۔ اور بعد ازاں جس کسی نے بھی اُس کے زاویے سے حیات کا نظارہ کیا، اُس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ ضرور نکل گئی اور وہ پھر کبھی پوری طرح سے سنبھل نہیں سکا۔

نطشے (NIETZSCHE) ۔ وہ "مجذوبِ فرنگی" جسے اقبال بیسویں صدی میں "مقام کبریا" دکھانا چاہتا تھا، غالباً پہلا شخص تھا جو شوپنہاور کے فلسفے سے شدید طور پر متاثر ہوا اور اگرچہ اُس نے جلد ہی اپنے لیے

ایک نئی شاہراہ دریافت کرلی۔ لیکن وہ غم جو ایک بار اُس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا، پھر کبھی اُس سے جدا نہ ہو سکا اور نطشے پر آخر دم تک غم کے دھندلکے چھائے رہے۔

لیکن نطشے کا فلسفہ محض شوپنہاور کے خیالات کا چربہ نہیں تھا۔ ایک لمبی مدت سے وہ مواد اکٹھا ہو رہا تھا جس کو ایک روز وسوویس کی چوٹی سے پھٹ کر بہہ نکلنا تھا، اس مواد کی تعمیر میں کانٹ کی "ذہن کی مخفی قوت"، ہیگل کے "تحرک اور انقلاب" شوپنہاور کی "غیر شعوری خواہش" اور ڈارون کی جہد للبقا اور بقائے بہترین" نے نمایاں طور پر حصہ لیا تھا اور اب یہ تمام نظریے نطشے کے دماغ میں غیر شعوری طور پر ایک نئے فلسفہ حیات کی صورت اختیار کر رہے تھے، جب کہ وہ خود زندگی کے ہنگاموں سے بہت دور کوہِ الپس کی بلندیوں پر بیٹھا تھا۔

اور پھر یکایک کوہِ آتش فشاں کا دہانہ پھٹ پڑا اور نطشے کی زبان سے شاعری اور فلسفے کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بہہ نکلا۔ کتاب مکمل ہو گئی۔ خود نطشے بھی جانتا تھا کہ یہ اُس کی زندگی کا شاہکار تھا۔ اس کے بعد اُس نے جو کچھ بھی لکھا تھا، وہ محض اس کتاب کا ضمیمہ ثابت ہونیوالا تھا۔ لیکن جب یہ کتاب چھپ کر منظر عام پر آئی تو اُس کی صرف ۴۰ کاپیاں بک سکیں۔ سات کاپیاں تحفتہً بھیجی گئیں۔ صرف ایک شخص نے کتاب کی رسید سے مطلع کیا، کسی نے تعریف کا

ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا۔

نطشے کے مطابق "مسرت پر ہم انسانوں کا کوئی حق نہیں ۔ یہ صرف اعلٰے انسان SUPERMAN ہی کو ارزانی ہو سکتی ہے ۔ ہمارا کام فقط اس قدر ہے کہ کام کرتے چلے جائیں اور یا تو خود اعلٰے انسان بن جائیں اور یا پھر اعلٰے انسان کے غلام بن کر اس کے اشاروں پر ناچتے رہیں"

نطشے کا اعلٰے انسان قوت، جوانمردی اور خودداری کا مظہر ہے اور چونکہ ان خصوصیات کا ارتقا جنگ اور انقلاب کا طالب ہے۔ لہذا اعلٰے انسان کی تخلیق کے لئے نطشے جنگ کو بھی "قابلِ تحسین چیز" سمجھتا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت بہادری ہے اور اس لئے ہر وہ چیز جو احساسِ قوت کو بڑھاتی ہے، "اچھی" ہے۔

نطشے کی دانست میں اجتماعی مسرت، اجتماعی ارتقا بے معنی چیزیں ہیں بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ انسان کا تصور بذات خود مضحکہ خیز ہے۔ زندگی' افراد' کا نام ہے اور ان میں سے ہر فرد اپنی ایک الگ شخصیت رکھتا ہے۔ انسانی مساعی کا کام یہ نہیں کہ اجتماعی مسرت میں اضافہ ہو بلکہ یہ ہے کہ فرد کا معیار بلند کیا جائے۔ چنانچہ وہ محبت کی شادی کو بنظرِ تحقیر دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ شادی صرف "بہترین" کے مابین ہونی چاہیئے۔

نطشے برائی اور بے رحمی کو نفرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ کہتا

ہے کہ ان چیزوں کا وجود ہی اس بات پر دال ہے کہ انسان کے لئے یہ از بس ضروری ہیں۔ اس لئے بھی کہ وہ ان سے بے اندازہ مسرت حاصل کرتا ہے۔ مثلاً انسان کا شکار، قتل، ٹریجڈی اور بے رحمی کے دوسرے مظاہر سے مسرت حاصل کرنا اُس کے اس رجحان کی کافی غمازی کرتا ہے۔

نطشے نے قوت، بے خوفی اور جرأت کی جس طرح پرستش کی ہے اور اعلٰے انسان کا جو تصور پیش کیا ہے اُس سے معًا خیال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کا مردِ مومن بھی چونکہ قریب قریب ان ہی خصوصیات کا مالک ہے لہذا کیا یہ تو نہیں کہ اقبال اس سلسلے میں نطشے سے متاثر ہو گیا ہے؟ میری دانست میں اس کا جواب "ہاں" بھی ہے اور "نہیں" بھی۔ "ہاں" اس لئے کہ بنیادی طور پر نطشے کے اعلٰے انسان اور اقبال کے مردِ مومن میں بہت کم فرق ہے دونوں خودداری، جرأت اور طاقت کے دیوتا ہیں اور دونوں کا کام افراد کو قعرِ مذلت سے اُٹھا کر بامِ ثریا تک پہنچانا ہے اور "نہیں"، اس لئے کہ نطشے کا اعلٰے انسان بہت سی باتوں میں اقبال کے مردِ مومن سے کمتر ہے۔ مثلاً نطشے کا اعلٰے انسان اگرچہ طاقت اور جرأت کا مظہر ہے لیکن اس میں وہ قلندرانہ اور فقیرانہ شان نہیں جو اقبال کے مردِ مومن کو ارزانی ہوئی ہے اور نہ اُس کا ذہنی افق اتنا وسیع اور اس کی روحانی عظمت اتنی واضح ہے۔ نطشے کے پیشِ نظر مادی ارتقا ہے۔ اقبال کے پاس شاہین کا تصور ہے جو

پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرتا ہے اور جس کے لئے کارِ آشیاں بندی ایک ذلت کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر جہاں اقبال نطشے کا ہم نوا ہو کر کہتا ہے کہ :-

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں !
وہ گلستان کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اور

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

وہاں وہ یہ کہہ کر نطشے سے بلند بھی ہو جاتا ہے کہ :-

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

نطشے کا اور انیسویں صدی کا آخری دم تک ساتھ رہا۔ اِدھر انیسویں صدی نے بیسویں میں قدم رکھا اور اُدھر نطشے عالمِ جاودانی کو سدھار گیا۔ لیکن نطشے انیسویں صدی کے مقبول نظریات کا علم بردار نہیں تھا۔ دراصل انیسویں صدی زندگی کے ٹھوس مادی نظریات کا زمانہ تھا، ڈارون نے غیر ارادی طور پر اور سپنسر (SPENCER) نے ارادتاً تمام کائنات کو مادہ کی ایک ایسی مشین

میں تبدیل کر دیا تھا۔ کہ جہاں ہر حرکت کے پسِ پُشت ایک واضح تحریک موجود تھی۔ اور جہاں کوئی چیز بھی میکانکی عمل سے آزاد یا ماورا نہ تھی۔ سماجی زندگی میں بھی یہ زمانہ سائنس اور مشین کے طفیل ایک نئے نظامِ حیات کا زمانہ تھا۔ جس میں صنعتی ترقی نے قدم جمانے شروع کر دیئے تھے، اور ایک نیا ذہنی اور اقتصادی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر اس مادہ پرستی نے جلد ہی انسان کو فنا، تہی دستی اور کم مائگی کا احساس دلانا شروع کیا۔ انسان پر روز بروز یہ چیز واضح ہونے لگی کہ وہ تو محض مشین کا ایک پُرزہ ہے اور مشین سے ہٹ کر اس کی اپنی ہستی نہ ہونے کے برابر ہے۔ احساسِ بقا کا یوں بے دردی سے چھن جانا انسانی مسرت کے لیئے ایک روح فرسا حادثہ تھا۔

ایسے میں برگساں (BERGSON) نے مادے کے شکنجے سے انسان کو آزاد کرانے کے لیئے اپنی مساعی کا آغاز کر دیا۔ اور فلسفے کی تاریخ میں قریب قریب وہی کام سرانجام دیا جو والٹیر کے زمانے میں کانٹ نے دیا تھا۔ یعنی محض ذہن کی دسترس سے انسانیت کو آزاد کروانے کی کوشش!

برگساں کی دانست میں زندگی، حرکت اور تحرک کا دوسرا نام ہے۔ اس کے مقابل مادہ، جمود، بے حسی اور موت کا علم بردار ہے اور ہر قدم پر زندگی کی پرواز کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن زندگی ہار نہیں مانتی اور اگرچہ اس کے بہت سے سپاہی اس معرکے میں کھیت ہو جاتے ہیں، وہ دندناتی

گونجتی اور جھنگھاڑتی، بڑھتی چلی جاتی ہے۔

آغازِ حیات میں، زندگی مادے کی طرح بےحس تھی اور اسی طویل جمود اور بےحسی میں اسے سکون میسر تھا۔ بعدازاں طبعی رجحانات کا سہارا لے کر یہ ایک نئی راہ پر روانہ ہوگئی۔ اور شہد کی مکھیوں کی سی تنظیم میں اسے سکونِ قلب حاصل ہونے لگا۔ لیکن اسے قرار کہاں؟ جلد ہی اس نے طبعی رجحانات کا لباس اُتار پھینکا۔ اور تخیل کی آزادروی سے مسرّت حاصل کرنا شروع کردی۔ یہ اس کا ارتقا تھا۔ طبعی رجحانات اب بھی موجود تھے اور اس کی مسرّت کے ضامن بھی تھے لیکن فہم و تخیّل کے طفیل زندگی کا اُفق بتدریج وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔

آج ہمارے سب اِقدامات، ہماری طویل مساعی، ہماری اُمیدیں اور ارادے اُس تحرّک اور قوّت کی بدولت ہیں جو زندگی کی صورت ہماری رگ رگ میں برقِ تپاں کی طرح دوڑ رہی ہے اور جس نے اِس زمین کو تحرّک سے ہمکنار کردیا ہے۔

اور کیا خبر کہ کسی روز چپکے سے زندگی کو اپنے دیرینہ دشمن 'مادّے' پر جو ہمارے مسلسل کرب والم، ہماری فنا اور تہی دستی کا موجب ہے۔ ایک زبردست فتح حاصل ہوجائے؟

اب چاہیئے تو یہ تھا کہ اُنیسویں صدی کا مادی نظریۂ حیات سائنس کی

روز افزوں ترقی کے طفیل بیسویں صدی میں اپنی گرفت کو اور بھی مضبوط کر لیتا لیکن ہوا یہ کہ جتنا مادے کا عمیق تجزیاتی مطالعہ ہوا۔ اتنا ہی مادے کی اُنیسویں صدی کی توضیح میں نمایاں انقلاب آتا چلا گیا۔ چنانچہ آئین سٹائن سر جینز، ایچ لیوی، سر اڈنگٹن اور دوسرے سائنس والوں نے مادے کی قلیل ترین صورت یعنی ذرّے ATOM کو بہت جلد ٹھوس صورت سے محروم کر کے، ایک سراپی کیفیت کا مظہر تسلیم کر لیا اور اسی حقیقت کو بنیاد قرار دے کر، مادے کی ساری کائنات کو جس کا ہم اپنے حواسِ خمسہ سے ادراک کرتے ہیں۔ غیر حقیقی قرار دیا۔ البتہ انہوں نے اِس بات پر زور دیا کہ اِس غیر حقیقی دنیا کے پسِ پشت "کچھ اور" بھی ہے کہ جس کا یہ عکس ہے۔ "یہ کچھ اور" کیا ہے؟ سائنس اس کا جواب دینے سے قاصر ہے لیکن قیاسِ اغلب ہے کہ جس طرح سائنس حُسن اور مزاح کے متعلق کچھ بتانے سے معذور ہے، اسی طرح اُس کی گرفت میں یہ "کچھ اور" بھی نہیں آسکتا۔ چنانچہ خیال ہے کہ وہ قوّت کہ جس سے ہم حسن اور مزاح کا ادراک کرتے ہیں، اِس سے ملتی جلتی قوت ہی سے کائنات کا ادراک ممکن ہے۔

بیسویں صدی کے فلسفیانی نظریات جہاں ایک طرف سائنس کی ترقی سے متاثر ہوئے، وہاں دوسری طرف حیاتیات، اور نفسیات کی جدید ترین تحقیقات نے بھی اِن پر بڑے واضح اثرات مرتسم کئے۔ ان میں سے حیاتیات نے

یہ مسئلہ پیش کیا کہ سماجی اور ذہنی ارتقا ایک ایسی زنجیر ہے، جس کی ہر کڑی "نسل" نے مہیا کی ہے۔ چنانچہ نسل کی حاصل کی ہوئی خصوصیات طبعًا اور فطرتًا اگلی نسل میں منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا ہے کہ آج بیسویں صدی کا ایک عام انسان پندرھویں صدی کے عام انسان سے ذہنی اور سماجی طور پر کافی بلند ہے اور علمی مسائل کو نسبتًا قلیل وقت میں سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح حیاتیات کے مطابق مسرّت ایک اِرتقائی کیفیت ہے اور انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ واضح ہوتی چلی گئی ہے۔ چنانچہ آج کا انسان اگلے زمانے کے انسان کی بہ نسبت فطرتًا زیادہ مسرّت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ اس لئے کہ مسرّت ایک ذہنی کیفیت ہے اور جدید انسان اگلے زمانے کے انسان سے ذہنی طور پر بلند ہے۔

موجودہ سائنس نے کائنات کو پُراسرار متصوّر کر کے اس کی حقیقت کو چیلنج کیا ہے اور یوں انسانی ذہن کو ایک عجیب قسم کی اُلجھن کے سپرد کر دیا ہے علاوہ ازیں اپنی انقلاب آور ایجادات کے ذریعے زندگی کو ہنگامہ پرور بنا کر سائنس نے انسانی ذہن کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پُرانے ماحول سے کنارہ کش ہونے اور نئے ماحول کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرف راغب کر دیا ہے اور یوں ذہن اور ماحول میں توازن کی ایک زبردست کمی پیدا کر کے جدید انسان کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔

دوسری طرف حیاتیات نے زندگی کو ایک نمایاں ضابطہ PATTERN مہیا کیا ہے اور مسرّت کی آئندہ ممکنات کے دروازے کھول دیئے ہیں لیکن نفسیّات نے پلٹ کر انسانی ذہن پر حملہ کیا ہے اور انسان کے بیشتر اقدامات، اُس کے مذہبی، سیاسی اور سماجی نظریّات کو لاشعور کی پُراسرار تحریکات کے تابع کر دیا ہے۔ نفسیّات کی خوردبین کے نیچے آج انسان ننگا ہو گیا ہے اور اُس کی حاصل کی ہوئی ساری شخصیت اور ارتقا محض تند و تیز لاشعوری خواہشات کے دباؤ کا نتیجہ قرار پایا ہے چنانچہ نفسیّات نے انسانی فہم کو اُس آلے کی حیثیت دے دی ہے۔ کہ جسے خواہش اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ بڑی چیز وہ لاشعوری خواہش ہے، جس کے ہاتھوں میں ہم انسان محض کٹھ پتلیوں کی طرح کھیل رہے ہیں۔

چنانچہ نفسیّات کے نظریّات کو اگر سچ مان لیا جائے تو زندگی کی تمام ارتقائی کیفیات، آرٹ، مذہب، محبّت اور روحانی تصورات کو جن سے انسان بے انداز مسرّت حاصل کرتا ہے، اُن دبی ہوئی اَنھونی خواہشات اور طبعی رجحانات کا نتیجہ ماننا پڑے گا کہ جن کے تند و تیز دھارے پر وہ کاغذ کی ناؤ کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے۔

نفسیّات نے بیسویں صدی کے ذہنی اور سماجی ماحول پر جو اثرات

مُرتسم کئے ہیں اُن میں سب سے اہم اثر یہ ہُوا ہے کہ لوگ قلیل سے قلیل وقت میں زیادہ سے زیادہ مسرّت حاصل کرنے کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ وہ یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ چونکہ ہم اپنے کرداروں کو خود تشکیل دینے سے قاصر ہیں اور چونکہ نہ ہم اپنا مستقبل خود بنا سکتے ہیں اور نہ اپنے ماضی ہی کو بدل سکتے ہیں۔ لہٰذا کیوں نہ تھوڑے سے وقت میں زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اُٹھا لیا جائے اور یوں "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" پر عمل پیرا ہو کر اپنی بے رحم فطرت سے انتقام لیا جائے؟

پس اس میں کوئی کلام نہیں کہ بیسویں صدی میں نفسیات نے قریب قریب اسی مادی نظریۂ حیات کو تحریک دی ہے جو انیسویں صدی میں ڈارون اور سپنسر کے طفیل اس قدر عام ہو گیا تھا۔ چنانچہ نفسیات نے مسرّت کے پھیلاؤ کو روک کر اُسے سمٹ جانے پر مجبور کر دیا ہے۔

یہاں تک ہم نے مغربی فلسفے کی تاریخ میں مسرّت کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے لیکن آنے والے ادوار میں مسرّت کو انسانی زندگی میں کیا مقام حاصل ہو گا؟ اس کی طرف ہم متوجہ نہیں ہو سکے اور شاید یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ کیونکہ آنے والے دَور تاریکیوں سے ہمکنار ہیں اور ہم ان تاریکیوں کا سینہ چیرنے سے عاجز!

پھر بھی پچھلے تجربات کی بنا پر آنے والے زمانے کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا ضرور جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم اس بات کو مدِ نظر رکھیں کہ کائنات کی لامحدودیت کے باعث یہاں 'کُل' کا احساس و ادراک کرنے کے لئے ہمارے پاس 'جزو' کے سوا اور کچھ نہیں اور اگر 'جزو' کا صحیح طور پہ تجزیہ کیا جائے تو 'کُل' کے متعلق حکم لگانا بھی بہت حد تک درست ہو سکتا ہے۔ جدید سائنس کے نظریات بھی اس مسئلے میں ہم سے متفق ہیں جب کہ وہ جوہر ATOM کو اُن خصوصیات کا مظہر تسلیم کرتے ہیں جو 'کُل' سے متعلق ہوتی ہیں۔ پھر رسولِ اکرم کا بھی قول ہے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (اگر تم خدا (کُل) کو پہچاننا چاہتے ہو تو خود (جُزو) کو پہچانو) پس اگر آنے والے ادوار میں مسّرت کا مقام معلوم کرنے کا ارادہ ہو تو فرد کی زندگی کے مختلف ادوار کا تجزیہ اور تاریخ کے ادوار کے ساتھ ان کی حیرت انگیز مناسبت کا مختصر سا جائزہ لینے کے بعد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ہمارے ذہنی اور مُعاشرتی مسائل کی دھندلی سی تصویر کیا ہو گی۔ اور مسّرت کو ہماری زندگی میں کیا مقام حاصل ہو گا؟

فی الحقیقت فرد کی زندگی انسانی تاریخ کے ادوار کا ایک پُراسرار لیکن مختصر سا خاکہ ہے، وہ یوں کہ فرد بچپن سے لے کر بڑھاپے تک جن

مختلف کیفیات و تجربات سے گزرتا ہے بعینہ انہی کیفیات و تجربات سے ساری انسانی تاریخ بھی گزری ہے۔ مثلاً فرد کے بچپن کے اوّلین ایّام انسانی تاریخ کے اُن ایّام سے شدید مماثلت رکھتے ہیں۔ جب انسان محض طبعی رجحانات کے اشاروں پر سرگرم و متحرک تھا اور حیوانوں کی مانند جنگل کی زندگی بسر کرتا تھا۔ بعدازاں جب اُس نے چار ٹانگوں کی بجائے صرف دو ٹانگیں استعمال کرنی شروع کیں اور اُس کا سر بلند ہو کر "اوّلین ذہنی شعور" سے آشنا ہُوا تو وہ بچے کی زندگی کے اُس دَور میں داخل ہو گیا جب وہ رینگنے کی بجائے چلنا شروع کر دیتا ہے، چنانچہ اب اُس کی مسرّت محض طبعی رجحانات کی مرہون نہیں تھی بلکہ اُس پر فہم و شعور کی اوّلین کرنیں بھی اثر انداز ہونے لگ گئی تھیں۔ یہی وہ دَور تھا جب انسان بچے کی طرح پہلی بار سوسائٹی کے قواعد و ضوابط سے آشنا ہُوا۔ اور نیک و بد، امر و نہی کے متعلق اُسے آگاہی ہونے لگی۔ سگمنڈ فرائڈ نے اپنی کتاب ٹوٹم اینڈ ٹیبو (TOTEM & TABOO) میں اُن بعض نیم وحشی قبیلوں کا ذکر کیا ہے جو آج بھی انسانی تاریخ کے اس دَور سے گزر رہے ہیں اور جو عجیب و غریب قواعد کی زنجیروں میں بُری طرح اسیر ہیں۔ انسانی تاریخ کا اگلا دَور اُس وقت شروع ہُوا جب انسانی تخیّل نے پَر تولنے شروع کئے اور افسانوں اور کہانیوں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہُوا جسے آج ہم دیو مالا کے نام سے جانتے ہیں۔

دیکھا جائے تو بچے کی زندگی کا بھی یہ وہ دَور ہے جب کہ وہ رات کے وقت اپنی امّی یا ابّا کے پہلو میں لیٹ کر آج بھی جنّوں، پریوں اور شہزادوں کی ننھی مُنی کہانیاں سُنتا اور بعدازاں دوسروں کو سُنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کہانیاں اُس کے تخیّل کی آزادروی کی تسکین کر کے اُسے بے انداز مسرّت مہیّا کرتی ہیں۔

تاریخ انسانی کا اگلا دَور فرد کے 'لڑکپن' سے شدید مماثلت رکھتا ہے۔ اب دیومالا کی پُراسرار اور اُلجھی ہوئی کہانیوں کی جگہ مذہب کے ٹھوس نظریّات اور زندگی کے اُصول و ضوابط لے لیتے ہیں اور بچے کے مذہبی میلانات کی نمایاں طور پر تشکیل ہونے لگتی ہے۔ پھر یہی وہ دَور ہے جب کہ انسانی تاریخ میں ہمیں جنگ و جدال کا لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے —— جنگیں جو مذہب عورت، زمین اور ملک گیری کے لئے لڑی گئیں۔ اور جنہوں نے تاریخ انسانی کو خون کے انگنت دھبوں سے داغدار کر دیا۔ بچے کی زندگی کا یہی دَور لڑنے جھگڑنے، مقابلے اور کھیل کی دُنیا میں گزرتا ہے۔ کھیل، ایک طرح سے فرد کے جنگجویانہ جذبات کو مائل بہ سکون کرتا اور اُسے تہذیب و تمدن کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی تحریک دیتا ہے۔

تاریخ انسانی کا اگلا دَور (موجودہ زمانہ) رُومانی دَور ہے اور یہ فرد کی اُٹھتی جوانی سے شدید مماثلت رکھتا ہے۔ اِس دَور میں جہاں آرٹ، لٹریچر، سائنس

اور فلسفہ کو بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی اور سوسائٹی مضبوط بنیادوں پر اُستوار ہوتی چلی گئی۔ نیز جمہوریت، سوشلزم اور کمونزم کو فروغ حاصل ہُوا، وہاں اس دَور میں چند ایسی باتوں کو بھی تحریک ملی جن کی وجہ سے آج سوسائٹی کی بنیادوں کے متزلزل ہو جانے کا بھی خطرہ ہے۔ دیکھا جائے تو فرد کی زندگی کا یہ رُومانی دَور بھی متضاد رجحانات کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف تو اس کی ذہانت نت نئے ساحلوں سے ٹکرانے لگتی ہے۔ وہاں دوسری طرف وہ خودکشی، تخریب پسندی اور خود اذیّتی کی طرف بھی مائل ہو جاتا ہے۔ اور سچ پوچھیئے تو آج انسانی تاریخ بھی ایک ایسے دوراہے پر پہنچ چُکی ہے جہاں ایک طرف اُس کی حاصل شدہ تہذیب، سائنس اور علم کی شاہراہ ہے اور دوسری طرف، ایٹم بم، ہائڈروجن بم اور اسی قبیل کے دوسرے خطرناک پتھروں سے بنا ہُوا راستہ! اب اگر انسان خودکُشی کی طرف مائل ہو گیا تو دیکھتے دیکھتے اس دنیا کا سارا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور اگر اُس نے دوسری شاہراہ اختیار کر لی اور خودکُشی کے راستے پر گامزن نہ ہُوا تو آپ دیکھیں گے کہ فرد کی زندگی میں بہت جلد ایسا دَور آئے گا جو فرد کی زندگی میں بھرپور جوانی سے مماثلت رکھتا ہے، یہ دَور تحصیلِ علم، سائنس اور بے پناہ انسانی قوّتوں کا دَور ہو گا۔ اور اِس میں بیماری، آبادی اور خوراک پر انسان پوری طرح قابو پا جائے گا ——— پھر یہاں سے انسان آہستہ آہستہ فرد کے اُس اگلے دَور کی طرف گامزن ہو گا جو بالآخر انسانی تاریخ کا سنہری دَور کہلائیگا

یہ دَور فرد کے "گرہست آشرم" سے مماثلت رکھے گا اور فرد کی بالغ نظری وسیع المشربی اور اُس کی زندگی کے مسائل پر مضبوط گرفت کا غماز و ترجمان ہو گا۔
اس دَور کی امتیازی خصوصیت ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل ہو گی جو افلاطون اور فرانسس بیکن کے مفروضہ UTOPIA سے بھی کہیں زیادہ بہتر ہو گی اور جہاں امن، مساوات، انسانی محبّت، اخلاقی بلندی اور خیال و اظہار کی آزادی کے طفیل مسرّت کو ایک پائدار بنیاد نصیب ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسا سماج ہو گا جو معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے غیر منقسم اور غیر طبقاتی (INDIVISIBLE & CLASSLESS) اور اقتصادی و مذہبی لحاظ سے ہر قسم کے نشیب و فراز اور تعصّب و عناد سے پاک و محفوظ ہو گا۔ ہندو علم الاصنام کے مطابق پہلے بھی ایک ایسا دَور گزر چکا ہے اور پھر بھی ایک ایسا دور آئے گا اور اُسے 'ست جگ' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
یہ تو معلوم نہیں کہ آیا واقعی ایسا کوئی دَور پہلے بھی گزر چکا ہے لیکن اتنا ظاہر ہے کہ ایسا دَور آئے گا ضرور، اور سچ پوچھئے تو یہی دَور رہنے کے قابل بھی ہو گا۔
فرد کی زندگی کے اَدوار کے ساتھ اگر تاریخی ادوار کی مماثلت کرتے چلے جائیں تو لامحالہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ سنہری دَور کافی طویل دَور ہو گا لیکن اتنا طویل بھی نہیں کہ اسے انجام نصیب نہ ہو سکے۔ چراغ تمام رات جلتا ہے لیکن

صبح ہوتے ہی ٹمٹمانے لگتا ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہے، ہر قدم کی ایک منزل ہے۔ جوانی کے خاتمے پہ بڑھاپے کا آسیب بھی رہتا ہے۔ جبکہ بقول خیاؔم ہر چیز پرانی اور بوسیدہ ہو کر ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک روز یہ سنہری دَور بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن آج ہی یہ تشویش کیوں؟ ابھی بہت وقت پڑا ہے، دیکھا جائے گا!!

مسرت اور فلسفہ

(۲)

اگر آپ غور کریں تو فلسفے کے تین پہلو آپ کو نمایاں طور پر نظر آئیں گے ——— ایک تو وہ کہ جہاں اُمر و نہی اور عمل و اخلاق کا تسلط ہے۔ اس کے مُبلغ وہ عظیم المرتبت لوگ ہیں جو جسمانی اور ذہنی پاکیزگی کو روحانی تربیت کا پہلا اور سب سے اہم سبق قرار دیتے ہیں، دوسرا پہلو وہ ہے کہ جہاں صرف فہم و خرد کی روشنی میں زندگی اور کائنات کا ادراک ہوتا ہے۔ یہ پہلو پیدائشی فلاسفروں کا حصّہ ہے اور مغرب کے بیشتر فلاسفر اس زمرے میں شامل ہیں ——— تیسرا پہلو وہ درمیانی دروازہ ہے جو روح اور مادہ اور عمل و تخیل کے سنگم پر واقع ہے اور جس سے گزر کر کائنات کی لامحدود وسعت کا احساسی اور ذہنی ادراک ممکن ہے۔ یہ پہلو مشرق کے عارفوں اور ویدانتیوں کی گزرگاہ ہے

فلسفے کا اوّلیں پہلو کہ جس اوپر ذکر ہوا اور جو حسین اخلاق اور اعلیٰ اعمال کے زینے پر قدم رکھتا ہوا آسمانی رفعتوں کی طرف پرواز کناں ہے، دراصل مشرق اور مغرب کے فلسفیاتی نظریات میں ایک "قدرِ مشترک" کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مشرق و مغرب کے قریب قریب ہر مذہب کے پیغمبر نے نفس کُشی اور اخلاقی بلندی پر زور دیا اور ذہنی اور جسمانی عشرتوں کو پروردگارِ عالم تک رسائی حاصل کرنے کے راستے میں سنگلاخ چٹانوں کا مُترادف جانا۔ غائر نظر سے دیکھا جائے تو فلسفے کے اس پہلو پر تقدیر پرست تصوّرات کا نمایاں تسلط نظر آئے گا یعنی یہ خیال زیادہ اہم ہو گا کہ چونکہ یہ دنیا فانی ہے لہذا اس کی تمام تر مسرّتوں اور عشرتوں پر بھی فنا کے دھندلکے چھائے ہوئے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ مذاہب میں جنت یعنی ابدی مسرّت کا تصوّر بڑا واضح ہے۔ مگر اس ابدی مسرّت کے لئے اس "کارزار" سے بخیر و خوبی نکل آنا بھی ضروری ہے جو زندگی کا جامہ اوڑھے اور ہزاروں حسین و لطیف اشیا کی صورت میں انسان کے دامنِ دل کو قدم قدم پر اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں فلسفے کا یہ پہلو موجودہ مسرّت پر آئندہ مسرّت کو ترجیح دیتا ہے اور زندگی کی عشرتوں سے منہ موڑنے اور خود کو آرزوں اور اُمنگوں سے چھٹکارا دلانے کو ہی روحانی سُرور اور اَبدی مسرّت کی سب سے اہم شرط قرار دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی خواہش کے ___ جسے شوپنہار نے "بھوکی خواہش" کا نام دیا تھا ___ تند بہاؤ کے راستے میں اس فلسفۂ حیات نے بند باندھ کر ایک طرح سے سوسائٹی کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور اخلاقی و سماجی اقدار کو معرضِ وجود میں لا کر انسان کو ایک ایسا مضبوط ضابطۂ حیات مرحمت فرمایا' جس کے بغیر شاید ہماری تہذیب کا ارتقا آج سے کہیں پہلے رُک چکا ہوتا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ فلسفے کے اس پہلو نے جب روزمرّہ زندگی کے حلقے سے نکل کر روحانی بلندی کو اپنی منزل کا ستارہ بنایا اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک طویل نفس کُشی تجویز کی تو انسانی مسرّت کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا اور زندگی سمٹ کر ایک تاریک سے خول میں مقیّد ہونے لگی۔

چنانچہ عجم میں صوفی ازم کے ارتقاء اور ہندوستان میں یوگ اور بھگتی کی تحریک اور مہاتما بدھ کے فلسفۂ حیات نے روزمرہ کی انسانی زندگی سے انسان کو منحرف ہونے اور زندگی کی ایک ایسی طویل سڑک پر گامزن ہونے کی ترغیب دی کہ جس کے خاتمے پر تو 'نروان' کا چراغ روشن تھا لیکن جس پر سفر کے دوران میں اداسی اور بے لبسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ البتہ نروان سے مراد خواہش کا خاتمہ تھا اور چونکہ 'خواہش' آلام و مصائب کا منبع تھی لہذا خواہش کے خاتمے پر ہی سکونِ قلب اور ابدی مسرّت کا حصول ممکن تھا۔ دیکھا جائے تو درحقیقت یہ طریق منفی مسرّت کا "علم بردار تھا اور اس پر عمل

پیدا ہونے کے لئے ایک طویل نفس کُشی اور غیر فطری زندگی کی ضرورت تھی۔ فلسفے کے اس پہلو کا ایک رنگ یہ بھی تھا کہ اس نے طالب یعنی انسان کو تو حقیر و ذلیل قرار دیا اور صرف مطلوب یعنی خالق کو اُن ارفع خصوصیات کا مظہر جانا جنہیں پانے کیلئے طالب کے لئے ازبس ضروری تھا کہ وہ اپنی انفرادیت کو یکسر تج دے اور صرف مطلوب کی خوشنودی کو اپنے پیشِ نظر رکھے۔ چنانچہ بیشتر اوقات اس فلسفۂ حیات کی بدولت خُدا کو کائنات میں وہی مقام حاصل ہو گیا جو اُس زمانے کے کسی ملک میں بادشاہ کو حاصل تھا اور انسان کا فرض یہ قرار پایا کہ وہ زندگی کی رعنائیوں سے منہ موڑ خدا کے آستانے تک پہنچنے کی سعی کرے۔ اس سلسلے میں اسد المحاسبی کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

"خدا نے اپنے جویا کے لئے خود اذیتی تجویز کی ہے تاکہ اُس کی روح تربیت پا سکے۔ لوگ اس انسان کی عظمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جس کے ذہن میں سوائے پروردگارِ عالم کے دوسرا کوئی خیال نہ ہو۔ جو ہر لحظہ آسمانی خوف کے تحت آنکھوں میں آنسو بھرے، انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ بسرِ اوقات کر رہا ہو ——— جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں، سر میں خاک ہو، گریباں چاک ہو۔ جسے اس بات کا خیال بھی نہ آئے کہ اس کا لباس تار تار ہے، جو اکیلا، اجنبی اور تنہا ہو ———"

اسی طرح جلال الدین رومی ایک جگہ رقم طراز ہے:۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ابراہیم نے کہ تخت پر جلوہ افروز تھا۔ محل کی چھت پر بھاری قدموں سے چلنے کی آواز سُنی۔

اس نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے پکارا ـــــ "کون ہے؟ کون ہے؟"

سپاہیوں نے اپنی گردنیں خم کر دیں اور کہا ـــــ 'حضور ہم ہیں اور تلاش کر رہے ہیں'۔

'کیا تلاش کر رہے ہو'؟ ابراہیم نے پوچھا۔

'حضور، اونٹ تلاش کر رہے ہیں' انہوں نے جواب دیا۔

ابراہیم نے حیرت سے کہا "بیوقوفو! کیا کبھی کسی نے چھت پر اونٹوں کی تلاش کی؟

'حضور! انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم تو آپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ آپ بھی تو تخت پر بیٹھے خدا کی تلاش کر رہے ہیں' ـــــ "

ظاہر ہے کہ خدا کے حضور تک پہنچنے کا یہ طریق خود اذیتی کے خارزار سے ہو کر جاتا ہے۔ اور فلسفے کے اس پہلو کے گہرے رنگ کا غماز ہے۔ بدھ اِزم اور بھگتی کی تحریکوں میں بھی خود اذیتی کا یہ رنگ بڑا نمایاں ہے اور یوگ کی ورزشیں بھی بڑی حد تک اسی طرزِ عمل کا اظہار ہیں۔

چنانچہ فلسفے کا یہ پہلو جو عام زندگی میں تو امر و نہی اور حسنِ اخلاق کے تابع ہے جب روحانی فتوحات کی مہم پر نکلتا ہے تو بھی انسان کے پاؤں میں

قواعد و اَخلاق کے بھاری سلاسل ڈال دیتا ہے اور انسان سے روحانی عظمت کے حصول کے لئے ذہنی و جسمانی، ہر طرح کی قربانی طلب کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اکثر و بیشتر 'راہ و رسم منزل ہا' کو 'منزل' کا مترادف سمجھ بیٹھتا ہے اور محض زہد و اِتقا کو زندگی کا آخری مرکز اور خدا تک رسائی کا واحد ذریعہ قرار دے دیتا ہے۔ چنانچہ اصل منزل تو گُم ہو جاتی ہے اور زُہد و پارسائی سے طفیل ایک نچلے درجے کی تمکنت اور رعونت جنم لے لیتی ہے۔ روحانی مسرّت کے راستے میں یہ ایک بہت بڑی روکاوٹ ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ خدا تک رسائی پانے کے لئے خود اذیتی اور نفس کُشی کا راستہ کافی طویل راستہ ہے اور بہت کم لوگ اس "صراطِ مستقیم" پر سے صحیح و سالم گزر سکے ہیں۔ صوفیائے کرام میں رابعہ کی مثال ایسی برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک ہے کہ جس نے جادۂ منزل کو تو کم اہمیت دی لیکن منزل پر اپنی نگاہیں برابر مرکوز رکھیں۔

"خدا! اگر میں تیری عبادت اس لئے کروں کہ مجھے جہنّم کا خوف ہو تو مجھے جہنم میں ڈال دے اور اگر میں تیری عبادت اس لئے کروں کہ مجھے جنت کی آرزو ہو، تو مجھے جنت میں داخل نہ ہونے دے، لیکن اگر میں تجھے صرف تیرے لئے چاہوں تو اے خدا! اپنے حسنِ لازوال سے مجھے

ہرگز محروم نہ رکھنا۔"

پھر بھی خدا تک پہنچنے اور روحانی ملاپ حاصل کرنے کا یہ راستہ ایک منفی راستہ ہے اور یہ کرم، یوگ اور بھگتی کے مشکل مقامات سے گزر کر گیان تک پہنچتا ہے نتیجتہً ایک طویل نفس کُشی روحانی سفر کے امکانات کو روبہ زوال کر دیتی ہے۔

فلسفے کا دوسرا پہلو کہ جس کے ترجمان مغرب کے بیشتر فلاسفر ہیں، اور جس کے طفیل صرف فہم و خرد کی روشنی میں کائنات کا ادراک ہوتا ہے، ایک علیحدہ بحث کا طالب ہے اور اسی لئے ہم ایک علیحدہ باب میں اس پر گہری نظر ڈال چکے ہیں۔ یہاں صرف اس بات کا اعادہ کرنے پر اکتفا ہوگا کہ اس پہلو نے الفاظ کے "رانا در جال" اور دلیل در دلیل کے چونے گارے سے جو رنگ محل تعمیر کیا ہے وہ ہمارے ذہنی تناؤ (MENTAL TENSION) کو آسودہ کر کے ہمیں مسرّت ضرور بہم پہنچاتا رہا ہے۔ البتہ یہ مسرّت، اُس مسرّت سے شدید مماثلت رکھتی ہے جو کسی ریاضی دان کو اُس وقت حاصل ہوتی ہے، جب کہ وہ ریاضی کے کسی مشکل سوال کو کافی تگ و دو کے بعد حل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ مسرّت شاید اُس روحانی مسرت کی رفعت کو نہیں پہنچتی جو فلسفے کے تیسرے پہلو یعنی دل و دماغ کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے اور جو خیالات و احساسات کی ایک سطح سے یکلخت اور لاشعوری طریق سے خیالات و احساسات کی ایک بلند تر سطح پر لے جا کر انسان کو احساس بجز آسا

OCEANIC FEELINGS سے ہم کنار کر دیتی ہے۔

اور اب ہم فلسفے کے اسی تیسرے پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں!!

ایک طرح سے دیکھا جائے تو فلسفے کا یہ پہلو جو ویدانت اور عرفان کے ارفع تصورات کی اساس پر اُستوار ہے بعض حلقوں میں خاصا بدنام ہو چکا ہے۔ ان حلقوں نے اس اندازِ نظر کو فرار کا راستہ قرار دیا ہے اور اس حسین تجربے سے یکسر انکار کر دیا ہے۔ جو عارف یا ویدانتی کی روحانی عظمت کا تنہا تماشائی ہے لیکن جسے وہ بدقسمتی سے ٹھوس حقائق کی طرح دکھانے سے قاصر ہے۔ موجودہ زمانے میں کسی شے کا وجود اس وقت تک مانا نہیں جاتا جب تک کہ اسے حسیات یا سائنسی آلات سے ثابت نہیں کیا جاتا اور اسی لئے یہ لوگ عارف یا ویدانتی کے روحانی تجربے کو ایک افیونی کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اس سے حاصل شدہ گہری مسرت کو انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے بیکار بلکہ مُضر قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ شاید اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ہماری حسیات نہ صرف کمزور ہیں بلکہ اُن کی تعداد بھی بہت محدود ہے اور جہاں تک سائنسی آلات کا تعلق ہے ہم ابھی تک ایک بحرِ ذخار کے کنارے کھڑے کھلونوں سے کھیل رہے ہیں۔ اگر ہمیں کسی طرح سے ایک مزید حس عنایت ہو جائے تو شاید ہمیں یہ کائنات ایک نئے ہی روپ میں نظر آئے۔ اسی طرح ہو

سکتا ہے کہ کل ایک ایسا سائنسی آلہ ایجاد ہو جائے ۔ جو زندگی کے متعلق ہمیں نئے نئے انکشافات ——————

بہم پہنچائے اور ہم کائنات کی لامحدودیت کا نئے طریق سے ادراک کرنے میں کامیاب ہو جائیں —— تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابھی بہت سی ایسی چیزیں (PHENOMENAE) بھی ہیں جنہیں ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں اور ہمارے کان سن نہیں سکتے لیکن جن کے وجود کا ہمارے دل و دماغ کی عظیم قوتوں کو احساس ہے —— عارف یا ویدانتی کا روحانی تجربہ بھی ہمارے دل و دماغ کی اُن قوتوں کا ایک کرشمہ ہے اور اس کا مزہ صرف وہی شخص چکھ سکتا ہے جس نے خود ان منازل تک رسائی حاصل کی ہو۔

چنانچہ اس روحانی تجربے کی گہرائیوں تک اُترنے اور اس سے بے اندازہ مسرّت حاصل کرنے کے لئے فلسفۂ ویدانت کی روشنی میں کائنات کی لامحدودیت کا علم حاصل کرنے اور پھر اس لامحدودیت کو محسوس کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اُپنشدمیں ویدانت کے نظریّے کو ایک کہانی کے روپ میں اس طرح پیش کیا گیا ہے :

"جب سوتیکا بارہ برس کا ہؤا تو اُسے ایک عالم کے پاس بھیج دیا گیا۔

جہاں وہ چوبیس برس کی عمر تک ٹھہرا، تمام وید، دنیا کے تمام عُلوم اُس نے وہیں حاصل کئے۔ لیکن جب وہ واپس لوٹا تو باپ نے پوچھا:۔
"سوتیکا! میرے بچے! تو نے اتنے عُلوم حاصل کئے، کیا تُو نے وہ علم بھی پڑھا جس کے طفیل ہم وہ سُن سکیں، جو سُنا نہیں جا سکتا، وہ دیکھ سکیں جو دیکھا نہیں جا سکتا اور وہ جان سکیں جو جانا نہیں جا سکتا"؟

"وہ علم کیا ہے پتا جی"! سوتیکا نے حیرت سے پوچھا۔

باپ بولا، "اُس سامنے والے درخت کا ایک پکا ہُوا پھل لے آ"۔

'لیجئے'

'اِسے کاٹ دے۔

'کاٹ لیا'

" تجھے کیا نظر آیا'

'کچھ بیج'

'اِن میں سے ایک بیج کو کاٹ دے۔

'کاٹ لیا'

"اس میں کیا نظر آیا"؟

'کچھ بھی نہیں'

باپ نے کہا، "بیٹا یہی تو تیری غلطی ہے۔ تجھے وہ کیوں نظر نہیں آیا"۔

کہ جس میں درخت کا سارا وجود سمایا ہُوا ہے۔ وہ جو ساری حقیقت کا عطر ہے۔ وہی تو سچائی ہے! وہی تو حقیقت ہے! اور ستوتیکا میرے بچّے! وہ تُو ہے ـــــ تت توام آسی!

وہ تُو ہے (THAT THOU ART) ویدانت اور عارفانہ تصوّرات کا پہلا سبق ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ وسیع و بے کنار، لامحدود و لازوال کائنات جو آغاز و انجام سے بے نیاز اور زمان و مکان سے ماورا ہے ـــــ فقط تُو ہے لیکن "تو" سے مراد ایک فرد کا محدود جسم نہیں ـــــ 'تُو' وہ زبان ہے کہ جس سے کائنات کی لامحدود وسعت اپنا اظہار کرتی ہے۔

مگر وہ 'تو' ہے صرف خطابت کیلئے ویدانت میں مستعمل ہے ورنہ ایک ہی قدم اُٹھانے پر فقو حیرت انگیز سرعت کیساتھ "وہ میں ہوں" آہم برہم میں تبدیل ہو جاتا اور کائنات کی زبان سے نکلی ہوئی آواز بن جاتا ہے اور یہی عارفانہ تصورات اور ویدانتی افکار کا عطر ہے

؎ ہرگز مجھے نظر نہیں آتا وجودِ غیر عالم تمام ایک بدن ہے میں ویدہ ہوں

اس سلسلے میں ویدانت نے اشیا کو ارتقا کے تین مدارج میں پیش کیا ہے، ـــــ تموگن، رجوگن، ستوگن، تموگن سے مراد وہ اشیا ہیں جو حرکت نہیں کر سکتیں، لیکن محسوس کر سکتی ہیں، مثلاً نباتات، رجوگن سے مراد وہ اشیا ہیں جو حرکت بھی کر سکتی ہیں اور محسوس بھی مثلاً چرند پرند۔ ستوگن آخری منزل ہے اور اس سے مراد وہ اشیا ہیں جو حرکت بھی کرتی ہیں، محسوس بھی کرتی ہیں

اور سوچ بچار بھی کر سکتی ہیں۔ مثلاً انسان۔ تو سوچ بچار کی یہ صلاحیت ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو حیوانات و نباتات سے متمیّز کرتی ہے اور دیکھا جائے تو یہی زندگی کا ارتقا اور حیات کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ لیکن جب یہ سوچنے کی صلاحیت، قوتِ احساس اور تحرّک سے لیس ہو کر نکلتی ہے، تو کائنات کی اس عظیم قوت کا روپ دھار لیتی ہے جس کا سہارا لے کر کُل کا احساس و ادراک ممکن ہے ——— اب چونکہ زندگی ارتقا کے مندرجہ بالا تینوں مدارج پر تو مشتمل ہے، لیکن اپنا بہترین اظہار صرف انسان کے ذریعے ہی کر سکتی ہے لہٰذا جب انسان روحانی اور احساسی ترقی کی آخری چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو لامحالہ اُن اجزا کی بھی آواز بن جاتا ہے کہ جو ابھی تموگن اور رجوگن کے ادوار سے گزر رہے ہیں۔

اور جب اس آواز میں خود آگہی پیدا ہوتی ہے اور انسان اپنی خودی کو پہچانتا ہے تو معاً اُس کا احساس ایک محدود جسم سے پھیل کر اُس وسیع و لامحدود کائنات کا بھی احاطہ کر لیتا ہے جس کا وہ نمایاں اظہار ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ احساس بجر آسا معرضِ وجود میں آتا ہے جو بیشتر جسمانی و ذہنی مسرّتوں سے ارفع اور لطیف ہے اور جسے ویدانتی ایک حسین تجربے خدا کے ساتھ وصال کے مسرّت آفریں لمحے سے یاد کرتے ہیں اور جو بقول اُن کے، انسانی زندگی کی سب سے بڑی جیت ہے۔

لیکن یہ خود آگاہی ایک طویل ذہنی اور روحانی تربیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ عشقِ حقیقی کے تدریجی ارتقا کو جہاں خالص علمی نقطہ نظر سے شرون (علم الیقین) امن (عین الیقین) اور ندصیاسن (حق الیقین) کے مختلف مدارج سے ظاہر کیا گیا ہے وہاں اس کے جذباتی مدوجزر کو بھی تین مختلف منازل تفویض کر دی گئی ہیں ——— ودیک، دیراگ، اور موکشتا۔ ان میں سے ودیک سے مراد ست کو است فانی کو غیر فانی اور سچ کو جھوٹ سے متمیز کرنا ہے۔ جب انسان پر کسی ناگہانی حادثے یا عزیز ترین شخص کی اچانک موت کی وجہ سے دفعتاً دنیا کی بے ثباتی کا راز فاش ہوتا ہے۔ تو اس کے دل میں اس دُنیا کے ——— لوازم کے خلاف ایک زبردست نفرت کا جذبہ کروٹیں لینے لگتا ہے اور اُسے دُنیا جہان کی ہر شئے رنگینیوں اور لطافتوں سے محروم نظر آنے لگتی ہے، یہ جذبہ اس بیزاری، بدمزگی یا دیراگ، کی حالت کو ظاہر کرتا ہے جو عشقِ حقیقی کی طرف ایک اہم اِقدام ہے اور جس کا اشارہ پاتے ہی انسانی جذبات سنیاس کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں عشقِ حقیقی کی تیسری حالت ——— موکشتا کا مطلب خواہشِ نجات ہے۔ زیست کے آلام و افکار سے نجات حاصل کرنے کی یہ خواہش ایک ایسی محیط و بسیط ہستی کو اپنی منزل کا ستارہ بنا لیتی ہے جو اُسے دنیاوی خلش اور بے رنگ و بو زندگی کی بجائے، لاانتہا مسرت اور ناقابلِ بیان لذت سے ہم کنار کر

سکے"[1] ——— لیکن فلسفے کے دوسرے نظریوں کے برعکس، ویدانت کے مطابق یہ لامحدود ہستی جس کے ساتھ وصال بے اندازہ روحانی مسرت کا ضامن ہے، کوئی علیحدہ مستقل ہستی نہیں بلکہ فرد کی شانِ کُلّی کی ایک صورت ہے۔ چنانچہ ویدانت کا سارا نظریہ ایک ہی نقطے پر رقصاں ہے ——— یعنی شانِ جُزوی سے شانِ کلی کی طرف برق رفتار پیش قدمی پر۔ اور تمام صاحبِ کمال عارفوں اور ویدانتوں نے اپنے اپنے رنگ میں اس پیش قدمی کو وہ "روشنی" قرار دیا ہے جس نے انہیں ایک احساسِ بےکراں سے ہم کنار کر کے اُن کی غم و اندوہ سے بھرپور جزوی زندگی کو ختم کر دیا اور سکون و مسرت کی کُلّی زندگی عطا کی۔

عارف یا ویدانتی کے مطابق ہمارے مسلسل کرب و الم کا باعث وہ غلط زاویہ ہے جس سے ہم زندگی اور کائنات کو دیکھتے ہیں اور جس کی وجہ سے عظیم و لامحدود کائنات اور اس کی بے پناہ قوتوں کے مقابلے میں ہمیں اپنی محدودیت، فنا اور تہی دستی کا بری طرح احساس ہوتا ہے۔ پس غور سے دیکھا جائے تو ہماری بیشتر ذہنی و جسمانی صعوبتوں کا باعث وہ احساسِ کم تری و کم مائگی ہے۔ جو قدم قدم پر ہماری راہ میں حائل ہے اور جو ہمیں

---

[1] "لذت اور صوفیانہ تصورات" از مصنف، ادبی دنیا، جولائی ۱۹۴۷ء

مستقل طور پر اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ہم فطرت کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلیاں ہیں، جو ان ہونی خواہشات اور ان دیکھے طبعی رجحانات کے اشاروں پر ناچتے ناچتے تاریکی سے برآمد ہوتی، تھوڑی دیر روشنی میں ناچ دکھاتی اور پھر ناچتے ناچتے تاریکی میں گم ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔ فنا ہو جانے کا یہ خوف تہی دستی کا یہ احساس اور کم تری و کم زوری کا یہ پہلو ہی دراصل ہماری مسرت کا سب سے بڑا حریف ہے اور ویدانت کا دعوےٰ ہے کہ وہ ہمیں ایک ہی جست میں اس تاریک خول سے اوپر اٹھا کر ایک ایسے سنگھاسن پر بٹھا دیتا ہے کہ جہاں کائنات کی اندھی قوتیں ہمیں اپنی گرفت میں محسوس ہوتی ہیں اور ہم فنا اور کم تری سے بلند ہو کر ایک عظیم و لامحدود قوت میں نہ صرف تحلیل ہو جاتے بلکہ اس کے ترجمان بن جاتے ہیں۔

اور لامحدودیت کا یہ 'علم' ویدانت کا ایک نہایت نمایاں پہلو ہے—— وہ پہلو جو ہمیں روحانی تجربے کی مسرتوں کی طرف گام زن کر سکتا ہے۔

لیکن کیسے ؟؟

وہ اس طرح کہ ویدانت کے مطابق یہ ساری کائنات جس کا ہم اپنے حواسِ خمسہ سے ادراک کرتے ہیں محض 'مایا' (سراب) ہے لیکن ہم اس کی غیر مستقل کیفیات و مظاہر میں اس درجہ محو ہو چکے ہیں کہ ہمیں وہ حقیقت نظر نہیں آتی جو ان سب کے پسِ پشت زندہ و قائم ہے۔ بعینہٖ

جس طرح سمندر کو دیکھتے ہوئے ہمیں صرف اُن موجوں کا احساس ہوتا ہے۔ جن کی اپنی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اُس سمندر کو ہم بھول جاتے ہیں۔ جو حقیقت ہے اور جس سے موجیں جنم لیتی اور جس میں آخرش تحلیل ہو جاتی ہیں۔

اس مسئلے پر ویدانت نے ایک اور طرح سے بھی روشنی ڈالی ہے اور وہ اس طرح کہ انسان ہر رات خواب کے رنگ محل بناتا ہے اور ایک فرد کے لباس میں اس کی مختلف منازل سے گزرتا، خوشی اور غم سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ مگر خواب کے دوران چونکہ اُسے اپنی خواب بین حیثیت کا علم نہیں رہتا لہٰذا وہ انتہائی سنجیدگی سے ہر چیز کو ٹھوس حقیقت سمجھتا ہے اور اُسے ایک لمحے کے لئے بھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ سب خواب ہے۔

اب اگر غور سے دیکھا جائے تو خواب کے دو پہلو ہوتے ہیں ـــــ ناظر (SUBJECT) اور منظور (OBJECT) ناظر سے مراد وہ ہستی ہے جو خواب بین کے ہمزاد کا روپ دھار کر خواب کی فضا میں متحرک رہتی اور خوشی و غم سے نبرد آزما ہوتی ہے ـــــ منظور سے مراد خواب کے وہ تمام دوسرے عناصر و مظاہر ہیں کہ جن کا خواب کے ناظر کو سامنا ہوتا ہے۔ ویدانت کے مطابق یہ کہنا غلط ہے کہ خواب کا ناظر ہی خواب کا خالق ہے، کیونکہ دراصل خواب کے ناظر اور منظور دونوں غیر حقیقی ہیں اور دونوں کا وجو

محض خواب بین کی روشنی طبع کا رہینِ منت ہے۔ خواب بین کے غم اندوہ کا باعث صرف یہ وجہ ہوتی ہے کہ وہ وقتی طور پر اپنی ہستی کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور خود کو خواب کے ناظر سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ مگر جس ایک لمحے اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اُسی لمحے خواب کا سارا گھروندہ (جو ناظر و منظور پر مشتمل ہے) نیچے آ رہتا ہے۔

اسی طرح ویدانت کے مطابق جاگتے کی دنیا بھی ناظر و منظور پر مشتمل ہے، لیکن عام طور پر فلاسفروں سے غلطی یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے اس دُنیا کے ناظر و منظور کو حقیقی ——— تصوّر کر لیا ہے اور اس بات کو فراموش کر دیا ہے کہ خواب کے ناظر و منظور کی طرح، بیداری کے ناظر و منظور بھی غیر حقیقی ہیں اور دونوں کا وجود اُس خواب بین ——— اُس سچے آتما، کا مرہون ہے جو اگرچہ ساری کائنات کے پسِ پُشت ایک واحد زندہ حقیقت ہے۔ لیکن جو بظاہر ناظر و منظور میں بٹ کر محدود ہو گیا ہے۔

چنانچہ ویدانت کے مطابق فرد کے آلام و مصائب تب تک ختم نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ ناظر و منظور دونوں سے بلند ہو کر کائنات کا جائزہ نہیں لے گا اور جب ایسا ہُوا تو اُسے صاف محسوس ہو گا کہ کائنات کی تمام اشیا، تمام کیفیات اور تمام کردار (حتیٰ کہ اس کا جسم بھی) اُس کی ہستی کے لامحدود پھیلاؤ میں سمٹے ہوئے ہیں اور وہ خود ہی کائنات کی ہر شے میں جلوہ گر ہے

یہاں میں اپنے ایک بزرگ کی بیاض سے چند جملے رقم کرتا ہوں :-

"ناظر و منظور میرے ہی خیال کی دو شاخیں ہیں -

اپنے ہی خیال سے میں ایک طرف ناظر ہو کر بھاستا ہوں -

اپنے ہی خیال سے میں دوسری طرف منظور ہو کر نمودار ہو رہا ہوں -

خیال بھی فرضی، من گھڑت ——— دونوں شاخیں بھی من گھڑت

نیند کے باعث پُرش اپنے آپ کو ناظر یعنی کرتا بھوگتا جیو مان رہا ہے،

کیا معنی؟ کہ اپنے آپ کو ایک علیحدہ ہستی مان رہا ہے -

نتیجہ ——— کثرت انیک ہستیوں کا بھان !

اگر اپنے آپ کو دیاپک مانے یعنی سب میں موجود دیکھے تو نتیجہ ——— وحدت

ایکتا کا بھان ! بقول شخصے :- ؏

گر گُل گزرد بخاطرت گُل باشی   در بلبلِ بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کُل است اگر روزے چند   اندیشۂ کُل پیشہ کنی کُل باشی

سوامی رام تیرتھ اس اہم نکتے کے متعلق رقم طراز ہیں :-

"جس ایک لمحے انسان کو احساس ہوا کہ وہ کُل ہے تو سمجھئے اُسی لمحے وہ اپنی حقیقت کو پا گیا۔ اب وہ آزاد ہے، تمام خطرات سے محفوظ، ہر خوف سے بے نیاز، ہر رنج، ہر دکھ سے آزاد !

آہ! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ہی غیر محدود قوت تمام اشکال میں

اپنا روپ دکھا رہی ہے، تمام شخصیتوں، تمام صورتوں میں جلوہ گر ہے، میں ہی وہ غیر محدود قوت ہوں کہ جس کے تخیل نے یہ لیلا رچائی ہے! اشکال انگنت ہیں، روح ایک ہے اور وہ روح میں ہوں انیتھونی (ANTHONY) نے محض جذبات میں، بروٹس (BRUTUS) نے محض شان و شکوہ میں، اور سیزر (CAESAR) نے محض حصولِ مملکت میں مسرت کی تلاش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اول الذکر کو ذلت ملی، دوسرے کو نفرت اور آخر الذکر کو ناشکر گزاری۔ اور ہر ایک بغیر مسرت حاصل کئے فنا ہو گیا ——

—— سچ ہے محض انکشافِ ذات (آتم انوبھو) ہی میں مسرت کا سارا خزینہ پوشیدہ ہے۔

اس بات کا علم حاصل کرو کہ سوائے تمہارے اور کوئی چیز موجود نہیں اور کوئی چیز موجود رہ ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ تم ہی لامحدودیت کا واحد اظہار ہو اب اپنی 'لامحدودیت' کو محسوس کرو[1]!!

---

[1] سوامی رام تیرتھ کا ایک اور فقرہ ہے۔

GOD IS LIKE A CIRCLE WHOSE CENTRE IS EVERYWHERE. BUT CIRCUMFERENCE NO--WHERE— REALIZE THAT & YOU ARE FREE!

—— اور لامحدودیت کے علم کے ساتھ ساتھ لامحدودیت کا یہ احساس ہی وہ پہلو ہے جس نے عارفانہ تصوّرات کو امتیازی صورت عطا کی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں جسم و روح، فہم و احساس کا حسین امتزاج ممکن ہے۔ ویدانت کے مطابق سچائی کی یہ دریافت، سچائی کا یہ احساس ہی ہمارے اُن تمام دکھوں کا واحد علاج ہے جو ایک جھوٹی خودی کے باعث معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

اب اگر ہم پلٹ کر اپنی تحقیقات پر ایک بھرپور نظر ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ محبّت، آرٹ، زندگی اور فلسفے میں مسرّت کے بہترین لمحات وہی ہوتے ہیں جب کہ انسان اپنی انفرادی ہستی کو یکسر فراموش کر کے، ایک اجتماعی کیفیت میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ نتیجتہً ایسی ایسی حیرت انگیز چیزیں معرضِ وجود میں آتی ہیں جو نہ صرف اپنے خالق کے لئے باعثِ مسرّت و راحت ہوتی ہیں بلکہ جو اپنی شدید اجتماعی کیفیت کے باعث ہزاروں لاکھوں افراد کو بھی مسرّت سے ہم کنار کر دیتی ہیں —— مگر جونہی انسان خود فراموشی کی کیفیات سے اُتر کر محدود خودی کے قفس میں قید ہوتا ہے تو یہ سارا طلسم ٹوٹنے لگتا ہے کائنات، جو بذاتِ خود ایک حیرت انگیز معجزہ ہے، کسی مقصد (MOTIVE) یا مقصدی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ بے پایاں خود فراموشی کی پیداوار ہے —— وہی خود فراموشی کہ جس میں ابدیّت کے سارے عناصر موجود ہیں اور جس میں

تحلیل ہو کر خود انسان بھی ابدیت کا مظہر بن جاتا ہے ـــــ عارفانہ تصور انتہا انسان کو اسی کیفیت کی ابدی رفاقت بہم پہنچاتا ہے جس کی جھلک اُسے زندگی کی ارتقائی کیفیات ـــــ محبّت آرٹ اور فلسفے میں وقتاً فوقتاً ملتی تھی اور جس کا وجود اگرچہ لمحاتی ہوتا تھا۔ لیکن جس کے طفیل انسان کو روحانی سُرور کے لازوال لمحات ضرور ارزانی ہو جاتے تھے۔

چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ عارف کا یہ حسین تجربہ، لامحدودیت کے ساتھ ابدی وصال کی یہ کیفیت محض انفرادی مسرت کی عَلم بردار نہیں، بلکہ اپنے نتائج کے طفیل عالمگیر انسانی مسرّت کی کفیل بھی ہے اور وہ اس طرح کہ جو دل ایک بار روحانیت کے اس جام سے سرشار ہوا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان سے اس شدید محبت کا علم بردار بن گیا کہ جسے آفاقیت کے ہمہ گیر لفظ کے سوا اور کسی نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا ـــــ ایسے انسان کو رنگ، نسل اور محدود مذہبی اور طبقاتی میلانات کی وہ قیود و حدود بے معنی نظر آتی ہیں جو انسان کو انسان سے نفرت سکھا کر زندگی سے مسرّت کی آخری رمق بھی بجھا دینے کے درپے ہیں اور جنہوں نے کچھ عرصے سے انسان کی پُرکیف کائنات کو بے برگ و بار کر دیا ہے ٭

"فرد، سماج اور مسرّت"

فرد، سماج اور مسرّت کا زیرِ نظر باب میرے مطالعۂ مسرّت کا آخری باب ہے میں نے اس کتاب کے آغاز میں عام زندگی میں مسرت کے امکانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن زیادہ تر میرا مقصد مسرت کی توضیح پیش کرنا تھا۔ بعد ازاں میں نے مسرّت کے تدریجی ارتقا کو واضح کرنے کیلئے محبت، آرٹ اور مشرق و مغرب کے فلسفیاتی نظریات کو زیرِ بحث لا کر مسرّت کی ارتقائی کیفیات کا بھی جائزہ لیا لیکن از بسکہ مسرّت نہ صرف عام انسانی زندگی سے شدید طور پہ وابستہ ہے بلکہ اس کی بقا کے لئے خونِ گرم کا درجہ بھی رکھتی ہے، لہٰذا یہ مطالعۂ مسرّت اُس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتا جب تک کہ یہ فرد اور سماج کے مابین اُس گہرے سمجھوتے کا جائزہ نہ لے کہ جسے مضبوط تر کرنے کے لئے عام انسانی مسرّت کے علاوہ محبت،

آرٹ، فلسفہ اور روحانی تصوّرات سے حاصل شدہ مسرت کی ارتقائی کیفیات بھی معرضِ وجود میں آتی ہیں اور جس کی مضبوطی کے باعث، کائنات کا یہ سب سے بڑا معجزہ جسے ہم انسانی زندگی، کے نام سے جانتے ہیں، اپنی تمام تر رعنائیوں اور بوالعجبیوں کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

اب فرد اور سماج کے ناقابلِ شکست رشتے کی تفہیم کے لئے اس بات کو مدِنظر رکھنا بڑا ضروری ہے (اور میں اس کا پہلے بھی اظہار کر آیا ہوں) کہ انسان، حیوان کے برعکس اپنے سماجی ماحول سے باہر زندہ رہ ہی نہیں سکتا ——— اور اس کی دو ایک بڑی نمایاں وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ جانور کی بہ نسبت انسان جسمانی طور پہ کم زور ہے اور اپنے ساتھیوں کے بغیر اور خاندان، قبیلے یا قوم کی سرپرستی کو تج کر، اُس خطرناک صورتِ حال سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا، کہ جس میں جہدِ للبقا کا اصول سرگرم ہے اور جس میں حیوان نسبتاً زیادہ محفوظ ہے۔ دوسری یہ کہ زندگی کے آغاز میں انسان کی ذہنی ترقی اور جسمانی ترقی کے مابین ایک شدید ناہمواری موجود تھی۔ دوسرے لفظوں میں، اس دنیا میں وارد ہونے کے بعد اُس کا جسم ابھی حالات سے موافقت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا کہ اُس کا ذہنی شعور ترقی کر کے اُسے اپنے ماحول کا ادراک کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ نتیجتہً اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک خطرناک دنیا میں اپنے کم زور اعضا کے ساتھ حادثات کا مقابلہ کرنے کے لئے یکہ و تنہا

رہ گیا ہے۔ چنانچہ ایک احساس کم مائگی نے جنم لیا اور یہ احساس کم مائگی بتدریج اُس کے احساس تنہائی کا محرک بنتا چلا گیا تا آنکہ انسان کو ایسے حربوں کی ضرورت پیش آئی جن کے طفیل وہ اپنی کم زور صورتِ حال کا دلیری سے مقابلہ کر سکتا۔ ان حربوں میں گفتار، جنسی محبت اور آرٹ کے حربے زیادہ نمایاں تھے کہ ان کی بدولت اُسے آگے چل کر اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ذہنی اور جسمانی مفاہمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملے اور یوں اُس سماج کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگیں جو اُس کے خطرناک ماحول کا واحد علاج تھا اور جس کا ایک جزو بن کر وہ جہد للبقا میں حیوان پر نمایاں برتری حاصل کر سکتا تھا۔

پس فرد کا تحفظ ہمیشہ سے اُس کے سماج کا رہینِ منت رہا ہے۔ یہاں تک کہ جسمانی یا ذہنی طور پر کسی فرد کو اُس کے سماجی ماحول سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیں تو اُس کی زندگی مسرت سے تہی رہ جائے گی

اوپر میں نے اُن چند حربوں کا ذکر کیا ہے، جن کے ذریعے فرد اپنے سماج کے ساتھ گہرے اور پائدار رشتے استوار کرتا ہے۔ ان میں سے گفتار اور آرٹ کے حربے تو اُسے عام زندگی میں اپنے ساتھیوں سے ہم کلام ہونے اور انہیں سمجھنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں اور جنسی محبت کا حربہ نسلِ انسانی کو جاری رکھنے اور فرد کے چاروں طرف خاندان اور قبیلے کی ایک سوشل فضا قائم کرنے میں اُس کا معاون ثابت ہوتا ہے، مگر ان حربوں پر سماج کی قیود

وحدود مسلّط ہوتی ہیں۔ اور فرد کے لئے یہ ضروری قرار پاتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنی سوسائٹی کے تحفّظ کے لئے ان قیود کے تابع رہے ـــــ ہاں کبھی کبھی اپنے ترقی پذیر ذہن کی بدولت اور احساس کی لطافت سے متاثّر ہوکر، فرد اپنی سوسائٹی کی قیود وحدود کو ایک قیدی کی طرح دیکھتا ہے اور اگرچہ اُس کا جسم تو سماج کے قفس میں قید رہتا ہے لیکن اس کی روح اس قفس سے پرواز کر کے آسمانی رفعتوں میں آزادی اور وسعت کی جستجو کرنے لگتی ہے ـــــ مگر یہ جستجو جلد ہی اُسے احساسِ تنہائی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس کا سماج تو زمین کے ساتھ چمٹا ہُوا ہے اور وہ خود آسمانی رفعتوں میں اکیلا محوِ پرواز۔ چنانچہ وہ اپنی حیرت انگیز قوّتِ اظہار کا سہارا لے کر اپنے احساسات ونظرّیات کو دوسروں تک پہنچانے کی پُرزور سعی کرتا ہے۔ اور تب اس کی یہ سعی، آرٹ اور لٹریچر کی بے مثال تخلیقات کی صورت میں ایک ایسے حربے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو نہ صرف اُسے اُس کے سماج سے دوبارہ ہم کلام کر دیتا ہے بلکہ جس کے ذریعے سماج کے لاتعداد افراد کو ایک دوسرے سے ہم کلام ہونے اور یوں سماجی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط کرنے کے مواقع بھی مل جاتے ہیں پس دیکھا جائے تو سوسائٹی اور فرد کے مابین جو رشتے استوار ہوتے ہیں اُن میں گفتار اور محبّت کے بالواسطہ رشتوں کے ساتھ ساتھ آرٹ کا بلاواسطہ رشتہ بھی معرضِ وجود میں آتا ہے۔

ویسے فرد کا تنہائی سے گریز اور سماجی ماحول کی طرف پیش قدمی زیادہ تر اُس کی "کشش اجتماع" کی رہینِ منت ہے۔ عام زندگی میں بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ انبوہ کی جانب غیر شعوری طور پر کھنچا چلا جاتا ہے ــــ کہ اس ہنگامے میں کھو کر وہ اُس احساسِ تنہائی سے محفوظ رہتا ہے، جو ازل سے اسکے تعاقب میں دیوانہ وار بڑھ رہا ہے اور جو اُس کی مسرت کا شاید سب سے بڑا حریف ہے۔ ایک اجنبی سرزمین پر پہنچنے کے بعد اُداسی اور کسی اجنبی سے مل کر تسکین کی کمی بھی اس طبعی رجحان کے وجود پر دال ہے لیکن شاید اس طبعی رجحان کا نہایت واضح اثر شہروں کی دن دگنی ترقی اور وسعت سے بھی ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں اس بات کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ آغازِ حیات میں انسان خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور اسی لئے اُن کا اقتصادی اور معاشرتی ماحول بھی ہر قسم کی پیچیدگی سے محفوظ تھا لیکن جب بدلتے موسموں کی بدعنوانیوں اور فطرت کے تباہ کُن مظاہر سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے زمین MOTHER EARTH کے ساتھ شدید وابستگی پیدا کی تو ایک ایسا نیا نظامِ حیات معرضِ وجود میں آنے لگا کہ جس میں ملکیت کا تصور بڑا اہم تھا اور جس میں ایک نیا اقتصادی اور معاشرتی ماحول پیدا ہونے لگا تھا ــــ وہ ماحول جو اپنی ہنگامی کیفیات کے باعث آگے چل کر انسان کی "کشش اجتماع" کی تسکین میں ممد ثابت ہوا اور جس کی محض اس خصوصیت کی وجہ سے انسان اس کی طرف بڑی

تیزی سے کھینچنے لگا لیکن ہوتے ہوتے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دیہاتی زندگی
میں اُداسی اور بدمزگی پیدا ہونے لگی اور انسان کے لئے طویل فرصت کے
اوقات بسر کرنا ایک مشکل امر ہو گیا۔ چنانچہ وہ ہنگامے کی تلاش میں شہری
زندگی کی طرف مائل ہونے لگا۔ آج بھی دیکھا جائے تو شہروں کی طرف انتقال
آبادی کی وجہ یہ نہیں کہ دیہات میں نان شبینہ میسّر نہیں آتا۔ بلکہ یہ کہ دیہاتی
ماحول زندگی کے وہ ہنگامہ پرور مناظر پیش کرنے سے قاصر ہے جو شہری
زندگی کے امتیازی نشان ہیں۔ چنانچہ آج ایک دیہاتی کے لئے شہری سکونت
اختیار کر لینا نسبتاً آسان ہے لیکن ایک شہری کے لئے دیہات میں
آکر بس جانا ایک امرِ محال۔ برٹرنڈ رسّل کی نظروں میں دیہاتی زندگی مکروفریب
کی زندگی ہے اور وہاں پانی، ہوا اور عناصر کی دوسری اندھی قوتوں سے انسان
کو برسرِ پیکار ہونا پڑتا ہے لہذا لوگ شہروں کی نسبتاً محفوظ فضا کی طرف
رجوع کرتے اور اپنی زندگیوں کو پُرمسرت بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔
لیکن مشہور ماہرِ نفسیات میکڈوگل کی دانست میں شہری زندگی بذاتہٖ، کوئی
پُرمسرّت زندگی نہیں اور دیہاتی زندگی کی بہ نسبت یقیناً زیادہ غیر محفوظ ہے
اس پر بیماری، لاچاری، غلیظ ہوا اور گندی خوراک اسے ناقابلِ برداشت
بنا دیتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود اگر لوگ جوق در جوق شہروں کی طرف
رجوع کرتے ہیں تو اُن کے اس اقدام کے پسِ پشت "کشش اجتماع" کا وجود

ہوتا ہے ـــــــــ یعنی یہ کہ وہ اس ہنگامہ پرور زندگی میں اپنے اُس زخم کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو احساس تنہائی کی صورت میں شاید ازل سے اُن کا ہم رکاب ہے اور جس نے اُن کے لئے زندگی سے تحصیل مسرّت کے امکانات کو انحطاط پذیر کر دیا ہے۔

یہاں تک ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان نے سماج کی تشکیل کی کیوں ضرورت محسوس کی اور ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اُس کے اس اقدام کے پسِ پشت اُس کی اپنی بقا کا سوال بڑا واضح ہے لیکن سماج کی تشکیل کے اس مسئلے کے بعد، فرد اور سماج کا وہ مسئلہ بھی زیر بحث آجاتا ہے جس کے مناسب حل پر فرد اور سماج دونوں کی مسرّت کا بڑی حد تک دار و مدار ہے اور جس میں توازن کی کمی نہ صرف فرد کو مذلّت کی گہرائیوں میں گرا دیتی ہے بلکہ جس کی وجہ سے سماجی نظام میں بھی رخنے نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور لاکھوں کروڑوں افراد کی مسرت معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔

چنانچہ دیکھا جائے تو فرد کو اپنے سماج کے ساتھ ذہنی اور جسمانی مفاہمت (COMPROMISE) کے چار بڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کہ ان کے مناسب حل پر زندگی کی بیشتر رعنائیوں کا انحصار ہے وہ چار مسائل یہ ہیں:۔

۱۔ سماجی قوانین کا تحفّظ

ب - کام کاج کا مسئلہ -

ج - جنسی زندگی میں توازن -

د - "قوت" کی تقسیم -

دیکھا جائے تو یہ چاروں مسائل فرد اور سماج کے بڑے مسئلے کے محض اجزا ہیں -

ان میں سے سماجی قوانین کا تحفظ، نارمل اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے بڑا ضروری ہے - وہ لوگ جو ذہنی یا اقتصادی وجوہ کی بنا پر سوسائٹی کے قوانین و ضوابط کو توڑ پھوڑ دینے پر تل جاتے ہیں، نہ صرف سوسائٹی کے دوسرے افراد کی مسرتوں کا قلع قمع کرتے ہیں بلکہ خود بھی سماج سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں - یہ علیحدگی اُن کی زندگیوں کو اُسی احساس تنہائی سے ہم کنار کر دیتی ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انسان نے سماج کی داغ بیل ڈالی تھی، چنانچہ ایسے لوگوں کے لئے عام شہری زندگی کی رعنائیوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ پاگل خانے یا جیل خانے کی محدود فضا میں اپنی زندگی بسر کرنے اور سماج سے قطعِ تعلق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں -

پاگل خانے یا جیل خانے کی طرف فرد کا رجوع تو ایک شدید مثال ہے - ورنہ عام زندگی میں سماجی قوانین کی خلاف ورزی (چاہے وہ

محض ذہنی ہی کیوں نہ ہو) فرد کے ضمیر کی ملامت کو تحریک دے دیتی ہے اور وہ خود اذیتی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں اس بات کو مدِّ نظر رکھنا بڑا ضروری ہے کہ ہماری زندگیوں میں رائے عامہ PUBLIC OPINION کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے لہٰذا ہم ہر اُس اقدام سے پرہیز کرتے ہیں جو رائے عامہ کو ہمارے خلاف کر دے۔ اس کے برعکس ہر وہ کام کہ جس سے ہم اپنے سماج کی خوشنودی حاصل کر سکیں، ہمارے لئے باعثِ مسرت ہے —— اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کی تاریکیوں میں جب پہلے پہل فرد نے سماجی قانون کی خلاف ورزی کی اور سماج نے اس فرد سے قطع تعلق کر کے (اور یوں اُسے سماجی ماحول سے باہر تنہائی و بےبسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر کے) سزا دی تو یہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کے ذہن پر مرتسم ہو گئی، کہ سماجی قوانین کا احترام نہ کرنا اپنے لئے سزا کو دعوت دینا ہے۔ اس کے برعکس چونکہ سماجی قوانین کا احترام کرنے اور سماج کی خوشنودی حاصل کرنے سے فرد کو زیادہ سہولتیں ملنے کی توقع تھی لہٰذا یہ بات اُس کے لاشعور میں پختہ ہو گئی کہ اُس کے لئے سماجی قوانین کا احترام - بڑا ضروری ہے۔

لیکن انسانی تاریخ فرد کی مختصر سی زندگی میں بھی خود کو کلیتاً دُہرا دیتی ہے

چنانچہ بچے کے اخلاقی معیار کو سنوارنے اور اُسے سماجی ماحول میں ایک اچھا شہری بنانے کے لئے والدین اُسے اخلاقی طور پر پابند کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُسے سزا کا خوف اور جزا کا لالچ دے کر سماجی قوانین کے احترام کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اوّلیں انسان کی طرح بچے کے لاشعور میں بھی یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ اُسے اُن تمام اقدامات سے پرہیز کرنا چاہیئے جو اُس کے والدین کی نظروں میں غلط اور غیر اخلاقی ہیں ——— بعد ازاں جوانی میں داخل ہونے پر جب اُسے اپنی غیر سماجی خواہشات و حرکات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے تو والدین کی جگہ اُس کا وہ ذہن لے لیتا ہے جس نے والدین کے ردِ عمل کو قبول کیا تھا۔ یہ انسانی ضمیر کا آغاز ہے۔

ڈاکٹر فاؤلر کی رائے میں ——— "انسانی فطرت کی، عام حالات میں اس طور تشکیل ہوئی ہے کہ جب ہم اپنے ماضی کے کسی غلط اقدام کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمیں اُس مسرت سے کہیں زیادہ افسوس ہوتا ہے، جو ہم نے اُس اقدام کے دوران حاصل کی تھی۔ اس کے برعکس، جب ہم اپنے کسی اچھے کام کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمیں اُس دُکھ سے کہیں زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے، جو اُس کام کو سرانجام دیتے وقت ہم نے برداشت کیا تھا" ——— یہاں تک تو انسانی ضمیر سماجی قوانین کے احترام کو پیشِ نظر

رکھ کر فرد اور سوسائٹی دونوں کی بقا اور مسرت کا کفیل ہوتا ہے۔ لیکن جب ضمیر اور فرد کے مابین کشمکش نیوراتی صورت اختیار کر جائے تو انسانی مسرت کو شدید خطرہ لاحق ہو جاتا ہے ——— اور یہ خطرہ اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنے ضمیر کی آواز سے متاثر ہو کر اپنی حیوانی خواہشات کا گلا تو سختی سے دبا دیتا ہے لیکن یہ خواہشات ختم نہیں ہوتیں اور جب بھی موقعہ ملے، دوبارہ شدت اختیار کر جاتی ہیں۔ اس پر انسانی ضمیر اور بھی تحریک لیتا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ کشمکش ایسے مقام پر جا پہنچتی ہے کہ جہاں فرد خود اذیتی پر اتر آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ جتنا نیک کوئی انسان ہوگا، اتنا ہی اُس کا ضمیر بھی زیادہ مضبوط ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے پیغمبر اور اوتار خود اذیتی کا شکار رہے۔

چنانچہ جہاں سوسائٹی کے قوانین کی خلاف ورزی خود سوسائٹی کو مجبور کر دیتی ہے کہ فرد سے قطع تعلق کرے وہاں فرد بھی اپنے ضمیر کی ملامت سے متاثر ہو کر خود اذیتی کے دور میں داخل ہو جاتا ہے (اگرچہ یہ حقیقت مستثنیات کے بھی تابع رہی ہے)۔

مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ فرد کو محض ایک ایسی مشین میں تبدیل کر دیا جائے جو سوسائٹی کے احکام و قواعد کے مطابق سرگرم رہے اور جس کی آزادی اور انفرادیت صفر کے برابر ہو۔ اس کے برعکس فرد کے سوسائٹی

کے ساتھ سمجھوتے کا صحت مند پہلو وہی ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے فلسفے کا بنیادی نکتہ قرار دیا ہے ـــــ یعنی یہ کہ فرد کی بقا ملت کا ایک ضروری جزو ہو جانے کی وجہ سے ہے ورنہ قوم یا ملت کے قلعے کے باہر فرد کی حیثیت محض ایک عضوِ معطل کی سی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علامہ اقبال، سوسائٹی کے زیرِ سایہ فرد کی انفرادیت کو پالنے پوسنے اور اُس کی خودی میں وسعت اور پھیلاؤ پیدا کرنے کے بھی متمنی ہیں اور اُن کی نظروں میں فرد کو چاہیئے کہ وہ اپنی خودی کو اس قدر وسعت دے کہ خالقِ کائنات تک سے ہمکلام ہو سکے۔ فلسفۂ اقبال کے یہ بظاہر متضاد نظریات اُنکے اشعار سے واضح ہیں:-

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مندرجہ بالا شعر فرد کو ملت میں مدغم ہو جانے کی ترغیب دیتا ہے لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ فرد کو اپنی انفرادیت کے پھیلاؤ کی طرف بھی متوجہ کر دیتے ہیں:-

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اسی طرح ایک خوبصورت شعر میں ان دونوں بظاہر متضاد نظریات کو وہ ایک ہی شعر میں سمو کر یوں پیش کرتے ہیں۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے

بعض لوگوں کی دانست میں اقبالؔ کے فلسفے میں یہ متضاد نظریات ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کے فلسفے کا عمل (EFFORT) اور رضا (RESIGNATION) کے ان متضاد رجحانات پر اُستوار ہونا ہمیں فرد اور سوسائٹی کے مابین اُس صحت مند رشتے کی تفہیم میں مدد بہم پہنچاتا ہے جو پُر مسرت سماجی زندگی کے لئے ازبس ضروری ہے۔

فرد اور سماج کا دوسرا مسئلہ کام کاج کا مسئلہ ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ فقط اتنی بات سے ممکن ہے کہ شاید خطِ استوا کے بعض منتخب مقامات کے سوا انسان کہیں بھی اس کرۂ ارض پر کام کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر وہ کام نہ کرے تو نہ صرف یہ کہ وہ سردی، گرمی، طوفان اور بھوک کے ہاتھوں خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ اُس کی تہذیب کا ارتقا اور اُس کے سماج کا سارا ڈھانچہ بھی ادھورا رہ جاتا ہے۔

ویسے بھی دیکھئے تو انسان بچپن کے ایام میں اپنے سماج پر ایک بارِ گراں کی حیثیت رکھتا ہے اور چونکہ دوسرے جانوروں کے برعکس وہ ایک طویل مدت تک اپنی ضروریات کا خود کفیل نہیں ہو سکتا، لہٰذا اُسے اپنے تحفظ، اپنی خوراک اور زندگی کی دوسری سہولتوں کے لئے اپنے سماج کا دست نگر

ہونا پڑتا ہے۔ لیکن سماج بچے پر جو سرمایہ لگاتا ہے، اس اُمید پر لگاتا ہے کہ بڑا ہونے پر وہ اس سرمائے کو مع سود ادا کرے گا۔ چنانچہ جوانی میں داخل ہوتے ہی فرد کے لئے یہ لازمی قرار پاتا ہے کہ وہ اپنا قرض اُتارنے کی کوشش کرے اور مسلسل کام سے اپنے سماج کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں ہو وہ لوگ جو اس بوجھ کو سہار نہیں سکتے اور کام کاج سے غفلت برتتے ہیں سماج بھی اُن سے بے اعتنائی برتنے لگ جاتا ہے اور ان کی زندگیاں تنہائی اور بے بسی کا شکار ہو جاتی ہیں پس فرد کی اپنی مسرّت اور اُس کے سماج کی بہبود کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ ایسے کام کرے، جن سے سماج کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگیں اور جن کے طفیل اجتماعی مسرّت میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ فرد اور سماج کے اس مسئلے کو بہتر طور پر حل کرنے کے لئے ہمیں شہد کی مکھیوں کی سی تنظیم کی ضرورت ہے کہ ان میں سے ہر مکھی مسلسل کام سے نہ صرف خود فائدہ اٹھاتی بلکہ شہد کے چھتے کے اجتماعی مفاد کو بھی پیش نظر رکھتی ہے۔

لیکن موجودہ زمانے میں کام کاج کے اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے بغیر فرد، طویل فرصت کے اُن لمحات کو بسر کرنے سے قاصر ہے جن میں بیشتر اوقات تنہائی اور اکتاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ دراصل فی زمانہ وہ جس شدّ و مد سے اپنے کام میں منہمک ہے اُس کی وجہ

یہ نہیں کہ یہ سارا کام اس کی بقا کے لئے ازبس ضروری ہے (کیونکہ اس سے بہت کم کام کرنے پر بھی وہ نارمل زندگی بسر کر سکتا ہے) بلکہ یہ کہ اس انہماک کے طفیل وہ اُس احساسِ تنہائی اور اُکتاہٹ سے گریز اختیار کر سکتا ہے، جو ہر قدم پر اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ غور کیجئے تو اس دنیا میں بہت سے ایسے دولت مند بھی ہیں جو اگر ساری زندگی کوئی کام نہ کریں، تو بھی زندگی کی سہولتیں اُن کو میسر رہیں لیکن جو اس لئے اپنے لئے نت نئے کام ڈھونڈتے ہیں کہ وہ اس طویل تنہائی کی اکتاہٹ سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے، جو اُن کے فرصت کے اوقات پر گھرے بادلوں کی طرح چھائی رہتی ہے اور وہ نہیں جانتے کہ کس طرح اس سے پیچھا چھڑائیں۔ اس کے علاوہ کام کاج کے طویل اوقات کے بعد فرصت کا قلیل لمحہ مسرت کا حامل بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے ہمارے نظام میں سیر و تفریح اور آرام و آسائش کے لئے ہفتے بھر کے کام کاج کے بعد چھٹی کا ایک دن شاید ازل ہی سے مقرر ہو چکا ہے۔

لیکن اس مقام پر کھیل تفریح اور کام کاج کے مابین بنیادی فرق کو واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کھیل تفریح سے تحصیلِ مسرت کی ممکنات سے کسی کو انکار ممکن نہیں لیکن کھیل سے حاصل شدہ مسرت اس حد تک کام کاج سے حاصل شدہ مسرت سے مختلف ہے کہ اس کا وجود فرد کے ذاتی انہماک کا رہینِ منت ہے اور اس کی اپنی نوعیت بھی زیادہ تر انفرادی ہے

اس کے برعکس، کھیل کی بہ نسبت کام کاج کہیں زیادہ سماجی پہلو کا امین ہے اور اپنے تعمیری انداز کے باعث اجتماعی مسرّت کا کفیل۔ دوسرے لفظوں میں کھیل صرف فرد کو مسرت بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن کام کاج سے سماج کے تمام افراد کو مسرّت ارزانی ہوتی ہے۔ البتہ جب کھیل کو زیادہ وسعت دے کر سماجی اور بعد ازاں قومی اور بین الاقوامی میل جول کا ذریعہ بنا لیا جائے، تو نہ صرف یہ افراد کو حصولِ مسرّت کے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ بلکہ سماجی نظام کی پائداری کا بھی موجب ثابت ہونے لگتا ہے۔

دراصل کام کاج کی طرح کھیل کا بھی وہی پہلو اہم ہے جو فرد کو اپنی محدود زندگی کے خول سے باہر نکلنے اور دوسرے افراد کے ساتھ میل جول بڑھانے کی ترغیب دے۔

مگر کام کاج سے حصولِ مسرّت کا ایک اور ایسا پہلو بھی ہے کہ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا —— یعنی فنی صلاحیتوں کا اظہار۔ اور جہاں اس پہلو کی درخشندگی کسی وجہ سے ماند پڑ جاتی ہے وہیں کام سے حصولِ مسرّت کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔ اب 'اظہار' سے مراد یہ ہے کہ کام کے طفیل فرد اپنی لازوال فنی صلاحیتوں کو منظرِ عام پر لا سکے۔ چنانچہ ایک مزدور کہ جسے اپنے کام کا انجام دیکھنا بھی نصیب نہ ہو سکے اور جس کی ساری تگ و دَو کا نتیجہ صرف چند سکّوں کی صورت میں ظاہر ہو، اُس

فنّی تسکین ARTISTIC SATISFACTION کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے جو مثلاً ایک اعلٰے معمار کو حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ وہ اپنی فنّی صلاحیتوں کو ایک عمارت کی صورت میں جلوہ گر پاتا ہے یا اُس فن کار کو ارزانی ہوتی ہے، جو آرٹ اور لٹریچر کے ناقابلِ فراموش شہ پارے تخلیق کر دیتا ہے۔ ایسا معمار یا ایسا فنکار اپنے کام کو بارِ گراں تصوّر نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کام کے دوران اُسے بے انداز مسرت حاصل ہو گی اور وہ اپنے کارہائے نمایاں کے طفیل اجتماعی مسرّت میں اضافے کا بھی موجب ثابت ہو گا۔ اس سلسلے میں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ اکثر و بیشتر کام میں دلچسپی اُسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جب کہ انسان ایسا کام کرے جو اُسے پسند ہو نہ کہ ایسا کہ جس سے وہ محض زندہ رہ سکے۔ فی زمانہ سماجی بدنظمی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اُجرت پر ایسا کام کرنے پر مجبور ہیں، جس میں انہیں شاید ذرہ برابر دلچسپی نہیں (ہمارے ملک کے بیشتر ادیب اسی بدقسمت طبقے سے تعلق رکھتے ہیں) چنانچہ جب وہ ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو اپنے سرمائے کی بدولت حسبِ منشا کام منتخب کر لیتے ہیں تو اُن میں بے اطمینانی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور وہ سماجی نظام کے پرخچے اُڑانے پر تُل جاتے ہیں۔ دراصل فرد اور سماج کی اُستواری کے لئے کام میں دلچسپی کا پہلو اس قدر ضروری ہے کہ میں محض اس بنا پر شخصی ملکیت کے تصور کو مستحسن سمجھتا ہوں۔ کیونکہ احساسِ ملکیت روزمرّہ کے کام

کاج میں فرد کی دلچسپی اور انہماک کو فزوں تر کر سکتا ہے ــــــ مگر ملکیت کی ایک حد ہونی چاہیئے کیونکہ جہاں کہیں دولت کی ناروا تقسیم ہوتی ہے، وہاں معاشرتی اور اقتصادی انصاف پر کاری ضرب لگتی ہے اور فرد کے لئے سماجی ماحول ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔

بیرآن وولف کے مطابق سماجی زندگی میں کام کاج کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہے کہ انسان کھاتا پیتا اور سوتا ہے اور یوں اپنے اندر فالتو قوتوں کا ایک ذخیرہ تیار کر لیتا ہے۔ اگر کام کاج میں دلچسپی اور انہماک کے ذریعے وہ ان فالتو قوتوں کو صرف نہ کرتا رہے تو لامحالہ یہ قوتیں بجلی کی طرح خود اُس انسان پر ٹوٹ گرتی ہیں اور وہ زندگی کی منفی راہوں مثلاً دیوانگی، خودکشی، وغیرہ کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف سوسائٹی خود بھی ایسے اعضا کو اپنے جسم سے کاٹ پھینکتی ہے جو ناسور زدہ ہو چکے ہوں اور غیر سماجی حرکات پر اُتر کر سماجی نظام کے لئے باعثِ خطرہ بن چکے ہوں۔ ایسے بیمار اعضا وہ چور، ڈاکو، پاگل اور جرائم پیشہ لوگ ہیں، جنہیں شہری زندگی کی بجائے جیل یا پاگل خانے کے محدود قفس میں دھکیل دیا جاتا ہے اور وہ عام زندگی کی مسرّتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

مگر اس ساری بحث وتمحیص کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ محض کام کاج ہی زندگی کی منزل ہے۔ اس کے برعکس محض کام کاج کو زندگی کی منزل

قرار دے دینا اکثر و بیشتر فرد کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اور وہ زندگی کی دوسری شاہراہوں پر آزادانہ پھرنے اور محظوظ ہونے سے محروم رہ جاتا ہے۔ عام زندگی میں ایسے انسان کی آنکھیں نہ صرف کائنات کی خوبصورتی کے لئے اندھی ہو جاتی ہیں بلکہ وہ سوشل تعلقات میں بھی خودغرضی کے شدید رجحانات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فرصت کے اوقات سے محظوظ ہونے کی صلاحیتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جب سب لوگ آرام کرتے ہیں تو بھی وہ کام میں منہمک رہتا ہے اور اگر کسی وجہ سے اُسے کام نہ ملے تو انتہائی بے بس اور بے بس نظر آنے لگتا ہے۔ اس شخص کی مثال اس بنیے کی سی ہے کہ جس نے دولت کو ذریعہ وسیلہ MEANS سمجھنے کی بجائے مقصد END سمجھ لیا اور ساری زندگی محض اسے اکٹھا کرنے میں گزار دی۔ مگر جس سے نہ تو اُس نے خود کوئی معقول فائدہ اٹھایا اور نہ اپنے سماج ہی کو فائدہ اٹھانے کی اجازت دی۔

جنسی زندگی میں توازن، فرد اور سماج کا وہ تیسرا مسئلہ ہے، جس کے مناسب حل پر دونوں کی مسرت کا ایک حد تک دار و مدار ہے۔ لیکن جس پر کچھ زیادہ توجہ صرف نہیں کی گئی۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سماجی قوانین سے انحراف یا کام کی عدم موجودگی خود فرد کے

لئے مہلک تھی لیکن جنسی زندگی میں توازن کی کمی سے فرد کو کوئی خاص نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ فرد نے اپنی ذاتی منطق یا اندازِ نظر کا سہارا لے کر جنسی زندگی کے متعلق چند اُصول وضع کر لئے اور اپنی جنسی زندگی میں ہر قسم کی بیرونی مداخلت کو ناقابلِ برداشت تصوّر کرنے لگا۔ چنانچہ میلانِ ہم جنسی، طوائف پن، جنسی بے راہروی وغیرہ کو اُس نے اپنی ذات سے منسوب کر کے خود کو ہر طرح کی سماجی پابندیوں سے مستثنےٰ قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن اُس نے یہ بات فراموش کر دی کہ جنسی زندگی میں توازن کی کمی سے خود سماج کو بے اندازہ نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔

غور کیجئے تو فطرت نے جنسی مسئلے کو کافی واضح انداز میں پیش کر کے اُس سے نسلِ انسانی کی بقا کا کام لیا ہے۔ چنانچہ ہر وہ پتھر جو جنس کی بہتی ندی کے راستے میں آ گرتا ہے، اس ندی کو کناروں سے چھلک جانے اور زندگی کی بیشتر دوسری شاہراہوں کو اپنی لپیٹ میں لے لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نتیجتہً جنسی بے رہروی نسلِ انسانی کی بقا کے مسئلے کو نظر انداز کر کے محض فرد کو لمحاتی لذت بہم پہنچانے کی طرف متحرک ہونے لگتی ہے اور سماجی نظام میں تعفن کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔

کہنے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ فرد کو چاہیئے وہ خود کو کلیتہً جنس کی اس

طوفانی ندّی کے حوالے کر دے اور محض فطرت کے اِشاروں پر بہتے بہتے نسلِ انسانی کی بقا کے لئے ممد ثابت ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت کے "جنسی میلان" کو اس کی سادہ ترین صورت میں تسلیم کر لینے سے فرد اُن غیر سماجی حرکات مثلاً جنسی بے رہروی، میلانِ ہم جنسی، طوائف پن وغیرہ سے محفوظ ہو جائے گا، جو ایک طرح سے سماجی نظام کی دیرینہ دشمن ہیں۔ لیکن محض ایک حیوان کی طرح فطرت کے اشاروں پر ناچتے رہنے سے اُس کی وہ لازوال فنی اور ذہنی صلاحیتیں شاید منظرِ عام پر نہ آسکیں جو اُسے نہ صرف حیوانوں سے متمیّز کرتی بلکہ اُسے کائنات کا ایک حیرت انگیز "معجزہ" قرار دے کر، اُسے لذّت کی بجائے مسرّت کے آستاں تک پہنچا دیتی ہیں۔ تو کیا پھر وہ نفسِ سرکش کے خلاف جہاد کرے اور جنسی خواہشات کو مسل دینے، دبا دینے، حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کرے ؟؟ —— نفسیات کی جدید ترین تحقیقات اس جہاد کو (جو فرد کی زندگی میں بڑی شدّ و مدّ کے ساتھ آتا ہے) فرد کی مسرّت اور سماج کی بہبودی کے لئے مضر قرار دیتی ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ نفسِ سرکش کبھی مغلوب ہو نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر اس کے خلاف جہاد کیا جائے تو کہانی کے جن کی طرح ہر وہ قطرۂ خون جو اس کی گردن سے نکلے گا، اُس میں سے سینکڑوں نفوسِ سرکش، پیدا ہو جائیں گے،

نفسِ سرکش کا تو ایک ہی علاج ہے کہ اس کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ ورنہ اگر یہ سوچا گیا کہ دریا کے سامنے بند باندھ دیا جائے گا اور وہ کناروں سے چھلکے گا بھی نہیں تو یہ محض ایک خوش فہمی ہوگی۔ ــــ ہاں ــــ دریا کو بہنے بھی دیجئے لیکن بند باندھ کر اس میں سے نہریں بھی نکال لیجئے کسی نہر کو حُبّ الوطنی کے خارزار میں لے جائیے اور کسی سے آرٹ اور زندگی کے وسیع و عریض علاقوں کو سیراب کیجئے۔ یہ آپ کی مرضی ہے، مگر ایک بات واضح ہے کہ جنس کی بے پناہ فالتو قوتوں سے یوں کام لے کر آپ نہ صرف خود مسرّت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے بلکہ اپنی سماجی زندگی میں بھی توازن اور اعتدال پیدا کر لینگے۔ اور یوں اجتماعی مسرت کے ضامن ثابت ہونگے۔

آخر میں، کام کاج کی طرح محض جنسی تسکین کو زندگی کی منزل قرار دے دینا بھی فرد کے حق میں مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنسی آزادی اُسے حصولِ لذّت کے بہت سے مواقع فراہم کر دیتی ہے لیکن اس بات سے شاید انکار نہ ہو کہ بھنورے کی طرح ایک پھول سے دوسرے پھول تک پرواز کرنے سے سیرابی کے ساتھ ساتھ تشنگی بھی فزوں تر ہوتی جاتی ہے تا آنکہ ایک روز اُس فرد کی زندگی کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اُسے محسوس ہونے لگتا ہے گویا وہ ایک ایسا

بے نوا فقیر ہے جو زندگی کی شاہراہ پر یکہ و تنہا سفر کر رہا ہو۔ اس کے برعکس جب جنس کو زندگی کا محض ایک شعبہ قرار دیا جائے تو نہ صرف نسلِ انسانی میں اضافہ کر کے فرد کو احساس بقا SENSE OF IMMORTALITY حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ اُس کے ذریعہ اپنے گرد اگرد خاندان کی ایک ایسی سوشل فضا بھی قائم کر لیتا ہے، جس میں خاندان کے تمام افراد کو اُس کی شکست و فتح سے انتہائی دلچسپی ہوتی ہے اور جو اُس کی مسرت اور غم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جنسی تسکین کی طرف فرد کا رجحان سماجی نظام کی تشکیل کے لئے انتہائی لازمی ہے۔

"قوت کی تقسیم" وہ چوتھا اہم مسئلہ ہے کہ جسے مناسب طور پر حل کرنا انفرادی و اجتماعی مسرت کے حصول کے لئے بے حد ضروری ہے۔ میں نے ارادۃً دولت کی جگہ قوت کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ اس لئے کہ دولت قوت ہی کی ایک صورت ہے —— یہ الگ بات ہے کہ دولت کی یہ قوت صحیح قوت نہیں اور اس نے سماجی زندگی کی بعض غلط کروٹوں سے جنم لیکر فرد اور سماج کو صدہا سال سے اپنے خونی پنجوں میں اسیر کر رکھا ہے۔ لیکن شاید میری بات ابھی واضح نہیں ہوئی ہیں دراصل کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دولت کی ناروا تقسیم نے انسان کو طبقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے اور یوں جنگ، قحط، بادشاہت اور سرمایہ داری کو معرضِ وجود میں لاکر، فرد اور سماج کو ایک

ایسی غلط روش پر گامزن کر دیا ہے کہ آج انسان اس کے خلاف پورے عزم اور شدّت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہُوا ہے۔ لیکن دولت کے خلاف انسانی بغاوت کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دولت سچی قوّت نہیں بلکہ بعض خودغرض افراد اور طبقات کی پیدا کردہ ہے۔ چنانچہ آج جمہوریت، سوشلزم، کمیونزم اور ایسی ہی دوسری تحریکوں کا سہارا لے کر انسان ایک ایسے نظامِ حیات کی طرف گامزن ہو رہا ہے کہ جس میں آخرش دولت کی ناروا تقسیم کا تصوّر ہی حرفِ غلط کی طرح مِٹ جائے گا۔

مگر یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آیا انسانی مسرت کا تمام تر دارومدار قوّت کی مساوی تقسیم پر ہے؟ کیا قوت فطری طور پر کبھی مساوی رہ سکتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہوا کے چلنے سے خزاں زدہ پتّوں کی طرح اکٹھا ہوتے رہنا ہی اس کی فطرت میں ہو —— چنانچہ دولت کی صورت میں نہ سہی، دوسری طرح سے یہ ایک ایسے فرد میں جمع ہو جائے جو دوسروں سے امتیاز حاصل کر لے اور جس کے سامنے عوام کو پھر جُھک جانا پڑے؟ ——

علامہ اقبال نے کہا ہے نا کہ "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"، —— لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ جب یہ کم بخت دیدہ ور پیدا ہو جائے تو دُنیا کو (چاہے وہ کمیونزم کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو) پھر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر سربسجود ہو جانا پڑے اور وہ اس بات کو بھول جائے کہ اُس

نے تو قوت کے ایک فرد کے پاس جمع ہو جانے کے خلاف بغاوت کی تھی؟ کہیں سٹالن کی مثال تو اس ضمن میں پیش نہیں ہو سکتی؟ ——— یہ سوالات گہری توجہ کے طالب ہیں اور ان کے مناسب حل پر ماحول اور سوسائٹی کی تشکیل کے نظریات میں توازن اور اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔

فرد سماج اور مسرّت کی اس ساری بحث کو ختم کرنے سے پہلے اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ انسانی مسرّت کوئی جامد یا ساکن چیز نہیں۔ چنانچہ یہ ملکیت میں اضافے یا سماجی ماحول میں ایک خاص بلند مقام حاصل کر لینے سے فرد کو ارزانی نہیں ہوتی بلکہ اس کا حصول اُن مفید اور مسرّت بخش اقدامات کے تابع ہوتا ہے کہ جن کے ذریعے فرد اپنے سماج کو زیادہ سے زیادہ مسرّت بہم پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو سماجی زندگی میں اخلاقی اور اخلاقیاتی اقدامات کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ فرد کو خود غرضی (SELFISH ENDS) سے بے غرضی (UNSELFISH ENDS) کی طرف راغب کر دیں تاکہ وہ اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے سماج کو مسرّت بہم پہنچانے میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لے سکے۔

اختتامیہ

انسان ازل سے "مسرّت کی تلاش" میں ہے اور ابد تک رہے گا۔
لیکن مسرت مقصود بالذات نہیں بلکہ اس کی منزل زندگی کی بقا ہے اور
اسی لئے اس کا حصول اُن حالات میں زیادہ ممکن ہے جن میں مفاہمت،
میل جول اور جذب وکشش کے زیادہ مواقع ہوں، اس کتاب میں مسرّت
کے تدریجی ارتقاء کا جائزہ لینے کے دوران میں مَیں نے اس حقیقت
پر سے پردہ اٹھانے کی ہلکی سی کوشش کی ہے کہ مسرّت کا حصول،
احساسِ تنہائی کو مفلوج کرنے اور دوسرے افراد سے قریب تر
آنے ہی میں پنہاں ہے۔ چنانچہ محبّت میں محبوب سے قُرب' آرٹ
میں دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کی دھن، رُوحانی تصوّرات میں
"انسان" کے لئے بے لوث محبّت کا جنم ـــــ دراصل ایسی صورتیں ہیں
جو افراد کے مابین مفاہمت پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہیں اور جن کے
نتیجے کے طور پر اجتماعی مسرّت میں بدرجہ غایت اضافہ ہوتا ہے پس اس زاویے

سے بھی اس کتاب کا مطالعہ رائگاں نہ ہوگا۔

مسرّت کے موضوع پر مغربی ادب میں بے شمار کتابیں موجود ہیں اور مشرقی زبانوں میں بھی یہ موضوع خاصا اہم رہا ہے لیکن از بسکہ اردو ادب میں فلسفیاتی مسائل اور خاص طور پر مسئلہ زیرِ بحث پر بہت کم غور و فکر ہوا ہے لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس ضمن میں کچھ کہنے کی کوشش کی جائے۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسرّت کی ماہیّت کے بارے میں میں خود تذبذب میں تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے بیشتر عقدوں کو حل کرنے کی سعی کروں۔ چنانچہ اس کتاب کی تیاری کے دوران میں مجھے اس مسئلہ پر مزید مطالعہ اور غور و فکر کا موقعہ ملا اور اگرچہ میں وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اس تلاش میں 'مسرّت' کو میں نے پا لیا تاہم مجھے یہ کہنے میں بھی تامّل نہیں کہ کئی بار مجھے اس سے قرب کا شدید احساس ضرور ہوا۔

مسرّت کے موضوع پر سوچنے اور لکھنے کی ضرورت مجھے اس لئے بھی محسوس ہوئی کہ تقسیمِ عظیم کے بعد سے ہمارے ملک میں سماجی، اقتصادی اور طبقاتی اُلجھنوں نے مسرّت کے سوتوں کو ایک حد تک خشک کر دیا ہے اور جہاں عام زندگی میں سطحیّت اور تصنّع نے گہرائی اور خلوص کی جگہ لے لی ہے۔ وہاں ہم لوگ بتدریج مسرّت کے ارفع تصوّرات سے ہٹ کر سستی ''لذتیّت'' کا شکار ہونے لگے ہیں۔ اور خطرہ ہے کہ اگر یہ حالت

زیادہ دیر تک قائم رہی تو ہم زندگی کی اعلیٰ اقدار (Great Values) ہی سے محروم نہ ہو جائیں۔ ہمارے سماج، ادب، تعلیم اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر ایسی صورتِ حال کے مضر اثرات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب اعلیٰ اقدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دینے کی ایک ہلکی سی کاوش ہے —— توقع ہے کہ اب اس سے بہتر کاوشیں منظرِ عام پر آنا اور اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنا شروع کر دیں گی۔

اور اب چند الفاظ اس کتاب کے عنوان کے بارے میں۔ یوں تو شاید "مسرت کا مسئلہ"، "مسرت" یا دوسرے عنوانات اس کتاب کے لئے زیادہ موزوں خیال کئے جاتے لیکن ان سے میرے اندازِ خیال کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔ کیونکہ دراصل اس ساری کتاب میں میں نے مسرت کے لئے ریاضی کے اصول وضع کرنے اور دو اور دو چار کہنے کی کوشش بہت کم کی ہے بلکہ شروع سے آخر تک زندگی کی گوناگوں کیفیات و مظاہر میں مسرت کی تلاش میں مصروف رہا ہوں۔ یوں سمجھئے کہ اس کتاب میں میرا کام چوراہے کے سپاہی کی طرح صرف منزل کی طرف اشارہ کرنا ہی تھا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ راستہ مسرت کی بجائے آپ کو کسی اور منزل کی طرف لے جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اسی راہ سے مسرت کے آستانے تک پہنچ جائیں۔

یہ "اختتامیہ" تشنہ رہ جائے گا اگر میں اپنے احباب، مولانا صلاح الدین احمد، امجد علی آغا اور وجیہہ الدین احمد کا شکریہ ادا نہ کروں جن سے میں نے وقتاً فوقتاً مسرت کے مسئلہ پر تبادلہ خیالات کیا اور جن کی گفتگو سے میں نے روشنی اور مسرت حاصل کی۔

وزیر آغا

کوآپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد آنریری
سیکرٹری اکادمی پنجاب طبع ہو کر دفتر اکادمی پنجاب مال روڈ لاہور سے شائع ہوئی۔